Registered No. L. 5340

ذی الحجہ ۱۳۶۸ھ

ماہنامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

نعیم صدیقی

جاری کردہ:

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

اے ذیلدار پارک، اچھرہ۔ لاہور

قیمت سالانہ پانچ روپے — برائے پاکستان — قیمت فی پرچہ آٹھ آنے

〃 سات روپیہ آٹھ آنے — برائے ہندوستان — 〃 گیارہ آنے

فہرست مضامین

جلد ۲۹ | شوال ۱۳۶۵ھ مطابق ستمبر ۱۹۴۶ء | عدد ۴

سید ابوالاعلیٰ مودودی پرنٹر و پبلشر نے مرکنٹائل پریس، چمبرلین روڈ، لاہور میں چھپوا کر دارالاسلام، پٹھان کوٹ، (پنجاب) سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

کوئی دعوتِ حق دنیا میں ثمر آور و نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی جب تک اس کے ساتھ ایک تدریجی اور مستقل پروگرام تربیت کا نہ ہو۔ اس چیز کے لیے یوں تو ہر دعوت و تحریک کی فطرت تقاضا کرتی ہے لیکن خصوصیت کے ساتھ ایک دعوتِ حق میں تو یہ ایسا لازمی جزو ہے کہ اس کے بغیر دعوتِ حق کا کوئی تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ یہ جیسا کہ پچھلی صحبتوں میں معلوم ہو چکا ہے۔ زندگی کے کسی ایک ہی گوشہ کو متاثر نہیں کرتی بلکہ اس کے تمام ظاہر و باطن کو ایک نیا جلوہ دیتی ہے۔ اور صرف کسی جزوی تبدیلی ہی کا مطالبہ لے کر نہیں اٹھتی۔ بلکہ ہماری ساری انفرادی و اجتماعی زندگی کے لیے ایک بالکل نیا سانچہ اور نئی اسکیم پیش کرتی ہے اس وجہ سے اس کا مزاج ہی یہ ہے کہ یہ جس تدریج و ترتیب کے ساتھ خود آگے بڑھتی ہے اسی ترتیب و تدریج کے ساتھ، اس کے بالکل متوازی، ایک تربیت کا پروگرام ہوتا ہے جو اہمیت میں کسی طرح بھی اصل دعوت سے کم نہیں ہوتا۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ تربیت کی اہمیت اصل دعوت سے کچھ زیادہ ہی ہوتی ہے تو شاید مبالغہ نہ ہو کیونکہ یہ تربیت ہی ہے جس کی وجہ سے کوئی دعوت دلوں میں جڑ پکڑتی، پھر نشوونما پاتی، پھر برگ و بار لاتی ہے یہاں تک کہ ایک دن اپنے فوائد و برکات سے زندگی کو مالا مال کر دیتی ہے۔

ایک داعی حق کے کام کی صحیح مثال ایک دہقان کے کام سے دی جا سکتی ہے۔ جس طرح اس کا مقصد صرف اتنی بات سے حاصل نہیں ہو سکتا کہ کچھ بیج کسی زمین میں ڈال کر فارغ ہو بیٹھے اسی طرح ایک داعی حق کا کام تنہا اس سے انجام نہیں پا سکتا کہ لوگوں کو کچھ وعظ سنا کر سو رہے بلکہ اس کے مقصد کی تکمیل کے لیے ضروری ہے کہ اس کے اندر اپنی پھیلائی ہوئی دعوت کے ساتھ وہی لگاؤ ہو جو ایک فرض شناس کسان کو اپنے بوئے ہوئے بیج کے ساتھ ہوتا ہے۔ جس طرح وہ نگرانی کرتا ہے کہ بیج زمین میں جڑ پکڑے۔ اس کو صحیح وقت پر پانی ملے۔ موسم کی ناسازگاریوں سے محفوظ رہے۔ صحیح طور پر نشوونما پائے۔ بیگانہ سبزے اس کی ترقی میں مزاحم

زمیوں، فضا کے پرندوں اور زمین کے چرندوں کی تاخت سے وہ سلامت رہے، اور اس کے لیے برابر اپنے دن کے اطمینان اور رات کے سکون کو وہ درہم برہم رکھتا ہے، لگاتار محنت اور مسلسل نگہداشت کرتا ہے، تب جاکر کہیں اپنی محنت کا پھل پاتا ہے۔ اسی طرح ایک داعی حق کو بھی اسی صورت میں اپنی دعوت کو پھلتے پھولتے دیکھنا نصیب ہوتا ہے جب وہ دعوت کے ساتھ ساتھ تربیت کی جانکاہیوں کے ایک طویل سلسلہ کو جھیلنے کی قابلیت اور ہمت رکھتا ہو۔ ورنہ جس طرح ایک غافل کسان کے بوئے ہوئے بیج زمین اور موسم کی بے حرمتی اور چرند و پرند کی ترکتازیوں کی نذر ہو جاتے ہیں اسی طرح ایک داعی کی دعوت بھی صدا بصحرا ہو کے رہ جاتی ہے۔

انبیاء علیہم السلام کے طریق دعوت و تربیت پر غور کرنے سے جماعتی تربیت کے لیے جو اصول مستنبط ہوتے ہیں ان میں سے بعض اہم چیزوں کو ہم یہاں بیان کرتے ہیں۔

(۱) جماعتی تربیت کا سب سے پہلا اور سب سے اہم اصول یہ ہے کہ داعی کو تعلیم و دعوت کے کام میں جلد بازی سے احتراز کرنا چاہیے۔ اس کو یہ برابر دیکھتے رہنا چاہیے کہ تعلیم کی جو خوراک اس نے دی ہے وہ اچھی طرح ہضم ہو کر لوگوں کے فکر و عمل کا جزو بن گئی یا نہیں؟ اس کا پورا پورا اندازہ کیے بغیر، اگر مزید غذا دی گئی تو اس کا نتیجہ صرف فساد معدہ اور سوء ہضم کی شکل میں ظاہر ہوگا۔ جن لوگوں نے داعیان حق کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے وہ اس بات سے ناواقف نہیں ہیں کہ ہر داعی حق سے اس طرح کی جلد بازی کے لیے دو طرفہ مطالبہ ہوتا ہے جو لوگ دعوت کو قبول کر چکے ہوتے ہیں وہ حق کی لذت سے ابھی نئے نئے آشنا ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ نئی نئی آشنائی ان میں حق کی ایسی بھوک پیدا کر دیتی ہے کہ تدریج و ترتیب کا پروگرام ان پر بہت شاق گذرتا ہے۔ وہ تند تند شوق بلکہ حرص حق میں اس طرح مبتلا ہو جاتے ہیں کہ نہ تو اپنی بھوک اور قوت ہضم کا صحیح اندازہ کر پاتے نہ جماعت کے دوسرے کمزوروں کی کمزوری کے ساتھ انھیں کچھ ایسی ہمدردی ہوتی۔ وہ اپنے آپ کو بھی اپنی اصل حیثیت سے زیادہ تولتے ہیں اور اپنے کمزور ساتھیوں کو بھی اپنے اوپر قیاس کرتے ہیں۔ اس کے سبب سے ان کی طرف سے برابر ہل من مزید کا مطالبہ رہتا ہے۔ ان کے ماسوا دوسرے لوگ، جو ابھی دعوت کے مخالف ہوتے ہیں، وہ دعوت کے کمزور پہلوؤں کی تلاش میں ہوتے ہیں۔ وہ اگر اس کے پیش کردہ پروگرام میں حرف گیری کی کوئی

گنجائش نہیں پاتے تو یہی مطالبہ شروع کر دیتے ہیں کہ اپنا پورا پروگرام پیش کرو۔ ان کا مقصد محض یہ ہوتا ہے کہ اگر کوئی چیز فوراً سامنے نہ آئی تو وہ لوگوں پر یہ ظاہر کر سکیں گے کہ یہ محض ایک بے مقصد اور مجہول دعوت ہے اس کے آگے نہ کوئی متعین منزل مقصود ہے نہ اس منزل مقصود تک پہنچنے کا کوئی واضح اور مضبوط پروگرام ہے اور اگر کوئی اسکیم پیش کی گئی تو اس میں کوئی نہ کوئی رخنہ ڈھونڈھ کر لوگوں کو دکھا سکیں گے۔ اور اگر کوئی رخنہ تلاش کے باوجود بھی نہ مل سکا تو اس کو پیدا کرنے کی کوشش کریں گے۔

ایک سچے داعی حق کے اندر تبلیغ حق کی ایک خواہش خود ہی دبی ہوئی ہوتی ہے جو اتنی قوی ہوتی ہے کہ اللہ کی بخشی ہوئی حکمت اگر اس کی نگرانی نہ کرے تو صبر و انتظار اور تدریج و ترتیب کے حدود و قیود کی وہ کبھی پابند نہ رہ سکے۔ اس خواہش کو یہ دو طرفہ مطالبہ جب مشتعل کر دیتا ہے تو بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ داعی میانہ روی کی اس روش سے ہٹ جاتا ہے جو اس کے مقصد کی حقیقی کامیابی اور جماعت کی صحیح تربیت کے لیے ضروری ہے۔ ہرچند حق کی صحیح قدر شناسی کا تقاضا یہی ہے کہ اس کے لیے آدمی میں زیادہ کی سی بھوک ہو جو اسے مضطرب بھی رکھے، بے صبر بھی بنا دے اور جلد بازی پر بھی مجبور کر دے لیکن حق کی قدر شناسی اور محبت کے مطالبہ سے جماعت کی تربیت کا مطالبہ کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا۔ اس وجہ سے ایک داعی کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان دونوں کے درمیان صحیح صحیح توازن قائم رکھے۔ اگر پہلی چیز کا تقاضا اس کو جلد بازی کے لیے بےچین کرے تو چاہیے کہ دوسری چیز کا مطالبہ اس کو انتظار پر مجبور کرے۔ اگر اعلان حق کا شوق اور حمایت حق کا جذبہ اس کو اکسائے کہ وہ نہ اہل شوق کے شوق کو تشنہ چھوڑے نہ معاندین پر اتمام حجت میں کوئی کسر باقی رہنے دے تو چاہیے کہ تربیت کے اہتمام کے لیے وہ اس پر بھی نظر رکھے کہ کہیں شراب قدح خوار کے ظرف سے زیادہ نہ ہونے پائے۔

جب کبھی ایسا ہوا ہے کہ پہلا جذبہ اس قدر غالب آگیا ہے کہ دوسرے پہلو کی پوری رعایت نہیں ہو سکی ہے تو جماعتی تربیت میں ایسا نقص رہ گیا ہے کہ بعد میں اس کی تلافی نہیں ہو سکی ہے۔ اسی رخنہ سے

شیطان نے جماعت کے اندر گھس کر انڈے بچے دیدیے اور پھر اس کے پھیلائے گئے فتنوں کے لپیٹ میں پوری جماعت آگئی۔ اس کی سب سے زیادہ عبرت انگیز مثال ہم کو بنی اسرائیل کی تاریخ میں ملتی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب مصر سے نکل کر سینا میں پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو احکام شریعت سے آگاہ کرنے کے لیے طور پر بلایا اور اس کے لیے ایک خاص دن معین فرمادیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس معین دن سے پہلے ہی طور پر پہنچ گئے۔ ان کے اندر اللہ کے احکام معلوم کرنے اور اس کی رضا طلبی کا جوجوش وجذبہ تھا اولاً تو وہ خود ہی اتنا قوی تھا کہ باریابی کا اشارہ پانے کے بعد وقت اور تاریخ کی پابندیاں اس پر شاق تھیں۔ ثانیاً قوم کی طرف سے ہر قدم پر جو مطالبے ہو رہے تھے اس سے بھی اس جذبہ کو تحریک ہوئی ہوگی۔ اگرچہ یہ جذبہ نہایت اعلیٰ اور محمود جذبہ تھا، اور طور پر معین وقت سے پہلے پہنچ جانا اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ اللہ کے احکام معلوم کرنے کے لیے نہایت بے چین اور مضطرب دل رکھتے ہیں لیکن اس معاملہ کا ایک دوسرا قابل اعتراض پہلو بھی تھا، جس کی طرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نظر نہیں گئی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فوراً بلانے کے بجائے ان کے لیے ایک خاص وقت مقرر کیا تو اس سے منشائے الٰہی یہ تھا کہ یہ وقفہ وہ قوم کی تربیت میں صرف کریں، اور جن اصولی باتوں کی ان کو تعلیم دی جاچکی ہے اس کو اچھی طرح ان کے اندر پختہ کریں تاکہ آزمائشوں اور فتنوں میں پڑنے کے بعد بھی وہ اپنے ایمان واسلام کو سلامت رکھ سکے۔ لیکن اللہ کے مزید احکام معلوم کرنے کا شوق ان پر اس قدر غالب آگیا کہ تربیت کی اہمیت کا احساس اس کے مقابل میں دب گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دین کے دشمنوں نے ان کی اس غیر حاضری اور قوم کی کمزوری سے فائدہ اٹھایا اور قوم کے ایک بڑے حصہ کو گوسالہ پرستی میں مبتلا کردیا اور اس کی ساری ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عجلت پسندی پر ڈالی، جو ہرچند تعلیم ودعوت کی راہ میں تھی لیکن تربیت کی ذمہ داریوں سے غافل کرنے والی ثابت ہوئی۔ چنانچہ قرآن مجید نے ان کی اس عجلت اور اس کے انجام کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

وَمَآ اَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ يٰمُوْسٰى — اور تم قوم کو چھوڑ کر، اے موسیٰ، وقت مقررہ سے پہلے، کیوں

قَالَ هُمْ اُولَآءِ عَلٰٓى اَثَرِىْ وَعَجِلْتُ اِلَيْكَ — چلے آئے؟ انھوں نے کہا وہ میرے پیچھے ہیں اور میں تیرے پاس

رَبِّ لِتَرْضٰى ۔ قَالَ فَاِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْۢ بَعْدِكَ وَاَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ (۸۳ - ۸۵ طٰہٰ)

اے پروردگار اس لیے جلدی چلا آیا کہ تیری خوشنودی حاصل کروں ۔ فرمایا تو جاؤ ہم نے تمھاری قوم کو تمھارے چلے آنے کے بعد فتنہ میں ڈالدیا اور سامری نے ان کو گمراہ کر ڈالا ۔

اس سے معلوم ہوا کہ ایک داعی کا جس طرح یہ فرض ہے کہ وہ لوگوں کو اللہ کے احکام و قوانین سے آگاہ کرے اسی طرح اس کا یہ بھی فرض ہے کہ پورے اہتمام کے ساتھ لوگوں کی تربیت بھی کرے تاکہ اس کی تعلیم لوگوں کے فکر و عمل کے اندر اس طرح راسخ ہو جائے کہ سخت سے سخت آزمائش میں بھی اُن پر اس کی گرفت قائم رہ سکے ۔ جو داعی صرف تعلیم کے پہلو پر نظر رکھتا ہے اور اس چیز کا شوق اس پر اس قدر غالب ہو جاتا ہے کہ تربیت کے لیے جو صبر و انتظار مطلوب ہے اس کا حق ادا نہیں کر سکتا ۔ اس کی مثال اس جلد باز فاتح کی ہے جو اپنے اقتدار کے استحکام کی فکر کیے بغیر مارچ کرتا ہوا بڑھا چلا جا رہا ہے ۔ اس طرح کی جلد بازی کا نتیجہ صرف یہی ہو سکتا ہے کہ ایک طرف وہ فتح کرتا ہوا آگے بڑھے گا دوسری طرف اس کے مفتوحہ علاقہ میں جنگل کی آگ کی طرح بغاوت پھیلے گی ۔

سورہ طٰہٰ میں ، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کی اس سبق آموز مثال کو پیش کر کے اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس عجلت پر گرفت فرمائی ہے جو آپ کے اندر احکام الٰہی معلوم کرنے کے لیے تھی ۔ آنحضرت بھی اپنے فطری شوق علم اور قوم کی جلد بازی کی وجہ سے چاہتے تھے کہ وحی الٰہی جلد جلد نازل ہو تاکہ آپ اپنے شوق علم کو بھی تسلی دے سکیں اور قوم کے مطالبہ کو بھی پورا کر سکیں ۔ چنانچہ اسی شوق کی وجہ سے جب وحی الٰہی اترتی تو آپ ایک پر شوق طالب علم کی طرح اس کے سیکھنے میں جلد بازی فرماتے ۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اس بات پر متعدد جگہ آپ کو ٹوکا کہ وحی الٰہی کی تکمیل کے لیے جو مدت مقرر ہے اس سے پہلے پورے قرآن کے اتار دیے جانے کے لیے جلدی نہ مچاؤ ۔ یہ وقفہ اور انتظار تمھارے دل کو مضبوط کرنے اور تمھاری قوم کی تربیت کے لیے ہے تاکہ جو کچھ تمھیں سکھایا جا رہا ہے اس کو تم بھی برداشت کر سکو اور تمھاری قوم بھی اس میں اچھی طرح پختہ ہو جائے ۔

وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ

اور قرآن کے لیے ، اس سے پہلے کہ اس کی وحی تم پر کیجائے

يُقْضٰى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا
وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ
وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا (۱۱۴ - ۱۱۵ - طہ)

جلدی نہ مچاؤ۔ (البتہ) یہ دعا کرتے رہو کہ اے میرے پروردگار میرے علم کو زیادہ کر۔ اس سے پہلے ہم نے آدم پر ایک ذمہ داری ڈالی تھی تو وہ بھول گیا اور ہم نے اس میں ارادہ کی پختگی نہیں پائی

اس آیت کے آخر میں جلد بازی سے بچنے اور تربیت کی اہمیت بھی واضح فرمادی کہ انسان میں یہ فطری کمزوری ہے کہ رغبات اور خواہشوں کے مقابل میں اس کا ارادہ کمزور پڑجایا کرتا ہے اس وجہ سے ضروری ہے کہ اس پر جو ذمہ داری ڈالی جائے اس کا پورا شعور پیدا کرنے کے لیے اس کی اچھی طرح تربیت بھی کی جائے تاکہ وہ آزمائشوں کے مقابل میں اپنے آپ کو ثابت قدم رکھ سکے

اسی تربیت کے تقاضے سے قرآن مجید تھوڑا تھوڑا کرکے اترا تو جلد باز مخالفین اعتراض کرتے کہ اگر یہ اللہ کی کتاب ہے تو یہ جستہ جستہ کیوں اتر رہی ہے، خدا کا علم تو حاضر و مستقبل سب کو گھیرے ہوئے ہے۔ اس کو تو نہ سوچنے کی ضرورت ہے، نہ تجربہ کرنے کی اور نہ کسی مصلحت پر نظر رکھنے کی۔ پھر وہ پوری کتاب ایک ہی دفعہ کیوں نہیں اتار دیتا؟ یہ تو صاف اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اپنی تصنیف ہے۔ غور و فکر اور محنت و تجربے کے بعد جتنی کچھ تیار کر پاتے ہیں اس کو پیش کرتے ہیں! ۔ قدرتی طور پر اس اعتراض کا اثر بہت سے مسلمانوں پر بھی ہوا اور یہ بات خود حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر بھی گراں گذری لیکن اللہ تعالیٰ نے نہ تو مخالفین کی جلد بازی ہی کی حوصلہ افزائی فرمائی اور نہ اس خلش ہی کو کچھ اہمیت دی جو نکتہ چینوں کے اس اعتراض اور فطری شوق علم کی وجہ سے آنحضرت صلعم اور آپ کے ساتھیوں کے دل میں پیدا ہوتی تھی بلکہ فرمایا کہ تمھاری اور تمھارے ساتھیوں کی تربیت کا تقاضا یہی ہے کہ یہ احکام تھوڑے تھوڑے کرکے ایک تدریج کے ساتھ اتریں تاکہ تمھارا دل بھی ان کے تحمل کے لیے پوری طرح مضبوط ہو جائے اور جماعت کے قوی اور ضعیف بھی ان کو اچھی طرح اپنا لیں۔ اگر جلد بازی کرو گے تو تمھاری امت میں کمزوری رہ جائے گی اور جس طرح سامری نے بنی اسرائیل کو گمراہی میں ڈال دیا اسی طرح کوئی سامری تمھاری امت میں بھی پیدا ہو کر اس کو گمراہی میں مبتلا کر دے گا۔

جو تدریج قرآن کے نزول میں ہم پاتے ہیں بعینہٖ وہی تدریج صحابہ اور بعد کے لوگوں نے اس کے سیکھنے اور سکھانے میں بھی ملحوظ رکھی اور اس کی مصلحت بھی بعینہٖ وہی تھی کہ جو لوگ اس کو سیکھیں اس طرح سیکھیں کہ یہ ان کے ذہن و دماغ کے اندر بھی پیوست ہو جائے اور ان کی عملی زندگی بھی بالکل اس کے رنگ میں رنگ جائے اور یہ بات صرف اسی صورت میں ممکن تھی کہ اس کی تعلیم ایک تدریج کے ساتھ، آہستہ آہستہ لوگوں کو دی جائے اور ساتھ ہی ساتھ اس علم کے مطابق ان کی تربیت بھی کی جائے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ قال کان الرجل منا اذا تعلم عشر ایات لم یجاوزھن حتی یعلم معانیھن والعمل بھن (ہم میں جو شخص دس آیتیں بھی سیکھ لیتا تو جب تک ان کے علم و عمل میں اچھی طرح پختہ نہ ہو جاتا آگے نہ بڑھتا)

۲۔ جماعتی تربیت کی دوسری اصل یہ ہے کہ داعی کمیت سے زیادہ کیفیت پر نظر رکھے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ داعی پر "کھوئی ہوئی بھیڑوں کی تلاش" کا شوق اس قدر غالب ہو جاتا ہے کہ وہ "گلہ کی بھیڑوں" سے غافل ہو جاتا ہے اور اس غفلت کا انجام یہ ہوتا ہے کہ وہ تو کھوئی ہوئی بھیڑوں کی تلاش میں میدانوں اور جنگلوں کی خاک چھانتا پھر رہا ہوتا ہے اور ادھر گلہ کی بھیڑیں یا تو بھوکوں مرنے لگتی ہیں یا کوئی بھیڑیا باڑے کے اندر گھس کر ان کو چیر پھاڑ ڈالتا ہے۔ جہاں تک داعیان حق کا تعلق ہے اپنوں سے یہ بے پروائی اور بیگانوں کو اپنانے کی یہ خواہش ان کے اندر نہایت نیک جذبہ سے پیدا ہوتی ہے۔ ان پر دعوت کا جوش اس قدر غالب ہو جاتا ہے کہ تربیت کے فرض کا احساس اس کے مقابل میں یا تو دب جاتا ہے یا کم از کم موخر ہو جاتا ہے۔ وہ اس بات کو زیادہ اہمیت دینے لگ جاتے ہیں کہ جو اللہ کے باغی اور نافرمان ہیں وہ پہلے اللہ کا نام لینے والے بن جائیں، رہی ان کی تربیت و اصلاح تو یہ چیز ہوتی رہے گی۔ بظاہر تو یہ ایک نیک خیال ہے لیکن اگر اس کی تہ میں اتر کر غور کیا جائے تو یہی اصل ہے کیفیت کے مقابل میں کمیت کو ترجیح دینے کی اور پھر آگے چلکر اسی سے یہ غلط نقطۂ نظر پیدا ہو جاتا ہے کہ لوگ دلوں کی جگہ سروں کی تعداد گن کر پوری طرح مطمئن ہو جاتے ہیں۔ قرآن مجید نے اس غلطی سے بچانے کے لیے داعیان حق کو یہ تعلیم دی ہے کہ جو لوگ دعوت سے بیگانے

ہیں ان کو پکارنے اور اپنانے کی خواہش اتنی غالب نہ ہو جانی چاہیے کہ اس انہماک میں ان غریبوں کا حق مارا جائے جو بیچارے دعوت قبول کر کے تربیت و تزکیہ کے لیے منتظر بھی ہیں اور محتاج بھی۔

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِينَ (۸۸۔ الحجر)	اور ان کی (کفار کی) بعض جماعتوں کو ہم نے جو مال و متاع کی فراوانی دے رکھی ہے اس کی طرف نظر نہ اٹھاؤ اور نہ ان کے انکار پر غم کھاؤ بلکہ مومنین کو اپنے سایۂ عاطفت میں لو۔
وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُم بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ وَلَا تَعْدُ عَيْنَاكَ عَنْهُمْ تُرِيدُ زِينَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا (۲۸۔ الکہف)	اور تم اپنے دل کو ان لوگوں کے ساتھ جماؤ جو صبح و شام اپنے رب کی رضا طلبی میں سرگرم دعا ہیں۔ ان سے غافل ہو کر تمہاری نگاہیں دنیاوی زندگی کی زینتوں کی طرف نہ اٹھیں۔
عَبَسَ وَتَوَلَّىٰ أَن جَاءَهُ الْأَعْمَىٰ وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهُ يَزَّكَّىٰ أَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنفَعَهُ الذِّكْرَىٰ أَمَّا مَنِ اسْتَغْنَىٰ فَأَنتَ لَهُ تَصَدَّىٰ (عبس)	اس نے تیوری چڑھائی اور منہ پھیرا اس سبب سے کہ اس کے پاس نابینا آیا، اور تمہیں کیا خبر کہ شاید وہ پاکی حاصل کرے یا نصیحت پکڑے اور نصیحت اس کو نفع پہنچائے۔ یا جو منہ پھیرتا ہے تو تم اس کے پیچھے پڑتے ہو۔

ان تمام آیتوں میں داعی کو اس بات کی ہدایت کی گئی ہے کہ جو لوگ دعوت قبول کر چکے ہیں اگرچہ وہ بظاہر تعداد کے لحاظ سے کم اور حیثیت کے لحاظ سے معمولی ہوں لیکن ان کی تربیت میں جو وقت صرف ہونا چاہیے وہ ان لوگوں کے پیچھے نہیں برباد ہونا چاہیے جو اگرچہ شان و عظمت رکھتے ہیں اور ان کی شان و عظمت سے دعوت کو فائدہ پہنچنے کی بھی توقع ہو سکتی ہے لیکن وہ گھمنڈ کے نشہ میں سرشار اور دعوت سے بیزار ہیں۔

۳۔ جماعتی تربیت کا تیسرا اصول یہ ہے کہ جماعت جن اصولوں پر مبنی ہے جماعت کے کسی گوشہ میں ان سے انحراف یا بغاوت کی بیماری نہ پھیلنے پائے۔ اگر اس قسم کا کوئی فتنہ سر اٹھاتا نظر آئے تو جماعت کے رہنماؤں اور ارباب کار کا فرض ہے کہ اس کے پھیلنے سے پہلے اس کے قلع قمع کی فکر کریں اور اس فرض کی

ادائگی میں نہ مصلحت بینی مانع ہو، نہ رواداری، نہ کسی کا خوف اور نہ کسی کی محبت۔ اس امر میں معمولی غفلت کا نتیجہ وہی ہوتا ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں ظاہر ہوا کہ قوم کا ایک بڑا حصہ خدا پرستی کی جگہ گوسالہ پرستی میں مبتلا ہو گیا۔ اس قسم کے فتنوں کے مقابل میں جماعت کے لیڈروں کو نہ صرف قوی دل ہونا چاہیے بلکہ کچھ مضائقہ نہیں اگر وہ سخت دل بھی ہوں تاکہ بالکل بے مروت ہو کر ان کو جڑ پیڑ سے اکھاڑ پھینکیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنی قوم کے اندر اپنی غیر موجودگی میں جب شرک کے فتنہ کے پھوٹ پڑنے کی اطلاع ہوئی تو سب سے پہلے طور سے واپس آکر انھوں نے ان لوگوں کو نہایت سختی سے ڈانٹا جو ان کی غیر موجودگی میں قوم کی نگرانی کے ذمہ دار تھے اور جن کی مروت یا رواداری کی وجہ سے اس خرابی کو پھیلنے کا موقع ملا۔ پھر انھوں نے اصلی مجرموں کو خود ان کے قبیلہ کے لوگوں کے ہاتھوں قتل کرا دیا تاکہ ہر شخص پر یہ اچھی طرح واضح ہو جائے کہ جو لوگ جماعت کے اندر اس قسم کے فتنے پھیلائیں گے وہ ان لوگوں کی طرف سے بھی کسی رحم یا رواداری کی توقع نہیں کر سکتے جن کے ساتھ وہ خون اور نسب کے قریبی رشتے رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس بت کو بھی ریزہ ریزہ کر کے ناپید کر دیا جو سامری نے بنایا تھا تاکہ اس فتنہ کا کوئی ادنیٰ نشان بھی قوم میں باقی نہ رہے اور ساتھ ہی خود سامری کو ایسی عبرت انگیز سزا دی جو اس کے ساتھ زندگی بھر کے لیے چمٹ گئی۔

جماعت کو اس قسم کی خرابیوں سے پاک رکھنے کے لیے اسلام نے یہ قانون بنا دیا ہے کہ جب جماعت کے بعض افراد میں جماعتی اصولوں سے کوئی انحراف پایا جائے تو پوری جماعت کا فرض ہے کہ اس کی روک تھام اور اصلاح کے لیے کوشش کرے۔ اگر جماعت ایسا نہ کرے، بلکہ افراد کو چھوڑ دے کہ جو ان کے جی میں آئے کرتے رہیں تو ان کے جرم کا وبال صرف ان ہی تک محدود نہیں رہتا بلکہ جماعت کے ناسق اور متقی سب اس میں حصہ پاتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس چیز کی حقیقت کشتی کی مثال دے کر سمجھائی ہے کہ اگر ایک کشتی کے مسافر اس شخص کا ہاتھ نہ پکڑیں جو کشتی کے پیندے میں سوراخ کر رہا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ کشتی ڈوبے گی اور ایک شخص کی شرارت کی سزا سب کو بھگتنی پڑے گی۔

اسی طرح اگر ایک جماعت اپنے اندر کے شریروں سے رواداری برتتی ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ یہ شریر جو آفت ڈھائیں اس میں بلا استثنا پوری جماعت مبتلا ہو۔ قرآن مجید نے اس خطرہ سے ان الفاظ میں آگاہ فرمایا ہے:

وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَّا تُصِيبَنَّ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنكُمْ خَاصَّةً وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ (۲۵ - الانفال)

اور اس آفت سے بچو جو خاص کر انہی لوگوں پر نہیں آئے گی جنھوں نے تمھارے اندر سے ظلم کیا ہوگا (بلکہ دوسرے بھی اس کی لپیٹ میں آئیں گے) یاد رکھو اللہ سخت پاداش والا ہے۔

اس فرض کو ادا کرنے کے لیے جماعت کے مختلف مدارج کے لحاظ سے طریق کار مختلف ہوگا لیکن نفس فرض سے جماعت کسی حال میں بھی بری الذمہ نہیں ہوتی۔

ــــــ ابتدائی مرحلہ میں، جب جماعت کو کوئی سیاسی طاقت حاصل نہیں ہوتی، صرف جماعت کا مزاج ان لوگوں کو اپنے اندر سے چھانٹ کر الگ کرتا رہتا ہے جو اس کے اصولوں سے انحراف کرتے ہیں۔ وہ اولاً تو ان لوگوں کو اپنے اندر جگہ ہی نہیں دیتی جو اس کے رنگ میں اچھی طرح رنگے ہوئے نہ ہوں اور اگر کسی طرح اس قسم کے خام لوگ اس کے اندر گھس بھی جاتے ہیں تو جس طرح ایک سلیم المذاق آدمی کے معدہ کے اندر مکھی قرار نہیں پکڑتی اسی طرح اس قسم کے لوگ اس نظام کے اندر نہیں ٹکتے۔ اگر اس مرحلہ میں کسی جماعت کا یہ حال ہو کہ اس کے اصولوں سے انحراف کرنے والے اس کے اندر آسانی سے پرورش پا سکتے ہوں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس جماعت کا کوئی مزاج ہی نہیں بنا ہے اور وہ بہت جلد منتشر ہو کے رہے گی۔

ــــــ دوسرے مرحلہ میں، یعنی جب جماعت کو سیاسی طاقت حاصل ہو جاتی ہے، جماعت کا سیاسی ادارہ اس بات کی نگرانی کرتا ہے کہ اس کے اندر فاسد عناصر پیدا ہونے یا گھسنے نہ پائیں اور وہ اس کی روک تھام کے لیے عام تبلیغی و تعلیمی وسائل کے ساتھ اگر ضرورت سمجھتا ہے تو طاقت کو بھی استعمال کرتا ہے۔ یہ سیاسی ادارہ اگر پوری فرض شناسی کے ساتھ اپنی ذمہ داری ادا کرتا رہے تو پوری جماعت مسئولیت سے بری رہتی ہے لیکن اگر خدانخواستہ یہ بگڑ جائے تو پوری جماعت کا فرض ہوتا ہے کہ اس کی اصلاح کے لیے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا علم لیکر اٹھے

اور جب تک اس کی اصلاح نہ کرلے چین کی نیند نہ سوئے۔ اس دعوتِ اصلاح کی حد قرآن مجید نے یہ تعین کی ہے کہ داعیانِ اصلاح صرف صدائے اصلاح پر قانع نہ ہو جائیں بلکہ مجرمین کے طرزِ عمل سے اظہارِ بیزاری کر کے ان کے جرائم سے اپنے آپ کو عملاً علیحدہ بھی کرلیں۔

۴۔ جماعتی تربیت کا چوتھا اصول یہ ہے کہ ابتدائے دعوت میں جہاں تک ممکن ہو لوگوں کو تعلیم و دعوت کے اصل مرکز سے وابستہ رہنے کی تاکید بھی کی جائے اور اس کا سامان بھی بہم پہنچایا جائے۔ جس دور میں جماعت کا مزاج بن رہا ہو اس دور میں مناسب ماحول اور اصل مرکز سے براہ راست استفادہ صحیح تربیت کے لیے سب سے زیادہ ضروری چیزیں ہیں۔ اس دور میں اگر ان دونوں چیزوں سے غفلت کی جائے تو جماعت کے اندر ایسے لوگ بہت کم پیدا ہوتے ہیں جو عقلی اور اخلاقی اعتبار سے اتنے مضبوط ہوں کہ اپنے آپ کو بھی دعوت کے اصلی رنگ میں رنگ لیں اور دوسروں کو بھی اس رنگ میں رنگ سکیں۔ بلکہ اس کے برعکس بیشتر ایسے لوگ پیدا ہو جاتے ہیں جن پر دعوت کا رنگ اتنا ہلکا ہوتا ہے کہ آزمائش کی ایک ہی بھٹی سے گذرنے کے بعد اڑ جاتا ہے۔ اس طرح کے لوگ نہ فہم کے اعتبار سے اتنے پختہ ہوتے کہ دوسروں کے اندر دعوت کا صحیح شعور پیدا کرسکیں نہ سیرت کے لحاظ سے اتنے مضبوط ہوتے کہ ہر طرح کے موافق و ناموافق حالات کے اندر اس دعوت کو جاری رکھ سکیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب تک کوئی موثر شخصیت موجود ہوتی ہے لوگوں کے اندر اس دعوت کا چرچا موجود ہوتا ہے لیکن جوں ہی وہ سامنے سے ہٹی سارا ہنگامہ سرد پڑ گیا۔ اسلام میں ہجرت کا جو حکم دیا گیا اس کے اندر جہاں اور بہت سی حکمتیں ہیں ایک بہت بڑی حکمت یہ بھی تھی کہ تمام مسلمان براہ راست حضور نبی کریم صلعم کے فیضِ صحبت سے فائدہ اٹھا سکیں اور ایک سازگار ماحول میں رہ کر اسلام کا رنگ ان پر اچھی طرح چھا جائے۔ جہاں یہ بات ممکن نہ ہو کہ ہر شخص اصل مرکزِ تعلیم و دعوت سے براہ راست فائدہ اٹھا سکے وہاں اسلامی دعوت کا کم سے کم مطالبہ یہ ہے کہ ہر گروہ کے ذہین اور صالح اشخاص کی ٹولیاں مرکز کی تعلیم و دعوت سے استفادہ کے لیے نکلیں اور دین کا فہم حاصل کرنے کے بعد جب اپنی قوم میں لوٹیں تو ان کو دین سے باخبر کریں۔

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَافَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوْا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ (توبہ - ۱۲۲)

اور سارے مسلمانوں کے لیے ممکن نہ تھا کہ وہ تعلیم کے لیے نکلتے تو ایسا کیوں نہ ہوا کہ ان کے ہر گروہ میں سے ایک ٹولی نکلتی تاکہ وہ دین کی بصیرت حاصل کرتی اور جب لوٹتی تو وہ اپنی قوم کو آگاہ کرتی تاکہ وہ بھی خدا ترسی کی راہ اختیار کرتے۔

(باقی صفحہ ۶۲ پر)

تفہیم القرآن

(۴۰)

یوسف

(از رکوع ۶ تا رکوع ۱۰)

ایک[۱] روز بادشاہ نے کہا "میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ سات موٹی گائیں ہیں جن کو سات دبلی گائیں کھا رہی ہیں، اور اناج کی سات بالیں ہری ہیں اور دوسری سات سوکھی۔ اے اہل دربار! مجھے اس خواب کی تعبیر بتاؤ اگر تم خوابوں کا مطلب سمجھتے ہو[۲]۔" لوگوں نے کہا "یہ تو پریشان خوابوں کی باتیں ہیں اور ہم اس طرح کے خوابوں کا مطلب نہیں جانتے۔"

اُن دو قیدیوں میں سے جو شخص بچ گیا تھا، اُسے ایک مدت دراز کے بعد اب بات یاد آئی اور اس نے کہا "میں آپ حضرات کو اس کی تاویل بتاتا ہوں، مجھے ذرا (قید خانے میں یوسف کے پاس) بھیج دیجیے[۳]۔" اُس نے جا کر کہا "یوسف! اے سراپا راستی[۴]! مجھے اس خواب کا مطلب بتا کہ سات موٹی گائیں ہیں

۱؎ بیچ میں کئی سال کے زمانۂ قید کا حال چھوڑ کر اب سررشتۂ بیان اس مقام سے جوڑا جاتا ہے جہاں سے حضرت یوسف کا دنیوی عروج شروع ہوا۔

۲؎ بائیبل اور تلمود کا بیان ہے کہ ان خوابوں سے بادشاہ بہت پریشان ہو گیا تھا اور اس نے اعلانِ عام کے ذریعے اپنے ملک کے تمام دانشمندوں، کاہنوں، مذہبی پیشواؤں اور جادوگروں کو جمع کر کے ان سب کے سامنے یہ سوال پیش کیا تھا۔

۳؎ قرآن نے یہاں بہت اختصار سے کام لیا ہے۔ بائیبل اور تلمود سے معلوم ہوتا ہے (اور قیاس بھی کہتا ہے کہ ضرور ایسا ہوا ہوگا) کہ سردار ساقی نے یوسف علیہ السلام کے حالات بادشاہ سے بیان کیے، اور جیل میں اس کے خواب اور اس کے ساتھی کے خواب کی جیسی صحیح تعبیر انھوں نے دی تھی اس کا ذکر بھی کیا۔

۴؎ متن میں لفظ "صدیق" استعمال ہوا ہے جو عربی زبان میں سچائی و راستبازی کے انتہائی مرتبے کے لیے استعمال

(باقی صفحہ ۱۴ پر)

جن کو سات دبلی گائیں کھا رہی ہیں اور سات بالیں ہری ہیں اور سات سوکھی۔ شاید کہ میں ان لوگوں کے پاس واپس جاؤں اور شاید کہ وہ جان لیں[۱]"۔ یوسف نے کہا "سات برس تک لگاتار تم لوگ کھیتی باڑی کرتے رہو گے، اس دوران میں جو فصلیں تم کاٹو اُن میں سے بس تھوڑا سا حصہ، جو تمھاری خوراک کے کام آئے، نکالو اور باقی کو اس کی بالوں ہی میں رہنے دو، پھر سات برس بہت سخت ہوں گے جن میں وہ سب غلہ کھا لیا جائے گا جو تم اُس زمانے کے لیے جمع کرو گے۔ اگر کچھ بچے گا تو بس وہی جو تم نے محفوظ کر رکھا ہو۔ اس کے بعد پھر ایک سال ایسا آئے گا جس میں باران رحمت سے لوگوں کی فریاد رسی کی جائے گی اور وہ رس نچوڑیں[۲] گے"۔ ع

بادشاہ نے کہا اسے میرے پاس لاؤ۔

شاہی فرستادہ یوسف کے پاس پہنچا تو اس نے کہا[۳] "اپنے رب کے پاس واپس جا اور اس سے پوچھ کہ اُن

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳) ہوتا ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ قید خانے کے زمانہ قیام میں اس شخص نے یوسف علیہ السلام کی سیرت پاک سے کیسا گہرا اثر لیا تھا اور یہ اثر ایک مدت دراز گذر جانے کے بعد بھی کتنا راسخ تھا۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱] یعنی آپ کی قدر و منزلت جان لیں اور ان کو احساس ہو کہ کس پایہ کے آدمی کو انھوں نے بند کر رکھا ہے اور اس طرح مجھے اپنے اُس وعدے کے ایفا کا موقع مل جائے جو میں نے آپ سے قید کے زمانہ میں کیا تھا۔

[۲] متن میں لفظ "یعصرون" استعمال ہوا ہے جس کے لفظی معنی "نچوڑنے" کے ہیں، مگر اس سے مقصود یہاں سرسبزی و شادابی کی وہ کیفیت بیان کرنا ہے جو قحط کے بعد باران رحمت اور دریائے نیل کے چڑھاؤ سے رونما ہونے والی تھی۔ جب زمین سیراب ہوتی ہے تو تیل دینے والے بیج اور رس دینے والے پھل اور میوے خوب پیدا ہوتے ہیں، اور مویشی بھی چارہ اچھا ملنے کی وجہ سے خوب دودھ دینے لگتے ہیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے اس تعبیر میں صرف بادشاہ کے خواب کا مطلب بتانے ہی پر اکتفا نہ کیا، بلکہ ساتھ ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ خوشحالی کے ابتدائی سات برسوں میں آنے والے قحط کے لیے کیا پیش بندی کی جائے اور غلہ کو محفوظ رکھنے کا کیا بندوبست کیا جائے۔ پھر مزید براں آپ نے قحط کے بعد اچھے دن آنے کی خوشخبری بھی دے دی جس کا ذکر بادشاہ کے خواب میں نہ تھا۔

[۳] یہاں سے لے کر بادشاہ کی ملاقات تک جو کچھ قرآن نے بیان کیا ہے ـــــ جو اس قصے کا ایک بڑا ہی اہم

(باقی صفحہ ۱۵ پر)

عورتوں کا کیا معاملہ ہے جنھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے؟ میرا رب تو ان کی مکاری سے واقف ہی ہے۔"[۵۰]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴) باب ہے۔ اس کو کوئی ذکر بائیبل اور تلمود میں نہیں ہے۔ بائیبل کا بیان ہے کہ بادشاہ کی طلبی پر یوسف[۴۰] فوراً چلنے کے لیے تیار ہو گئے۔ حجامت بنوائی، کپڑے بدلے اور دربار میں جا حاضر ہوئے۔ تلمود اس سے بھی زیادہ گھٹیا صورت میں حضرت یوسف کو پیش کرتی ہے۔ اس کا بیان یہ ہے کہ "بادشاہ نے اپنے کارندوں کو حکم دیا کہ یوسف کو میرے حضور پیش کرو، اور یہ بھی ہدایت کر دی کہ دیکھو ایسا کوئی کام نہ کرنا کہ لڑکا گھبرا جائے اور صحیح تعبیر نہ دے سکے۔ چنانچہ شاہی ملازموں نے یوسف کو قید خانے سے نکالا، حجامت بنوائی، کپڑے بدلوائے اور دربار میں لا کر پیش کر دیا۔ بادشاہ اپنے تخت پر بیٹھا تھا۔ وہاں زر و جواہر کی چمک دمک اور دربار کی شان دیکھ کر یوسف ہکا بکا رہ گیا اور اس کی آنکھیں خیرہ ہونے لگیں۔ شاہی تخت کی سات سیڑھیاں تھیں۔ قاعدہ یہ تھا کہ جب کوئی معزز آدمی بادشاہ سے کچھ عرض کرنا چاہتا تو وہ چھ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جاتا اور بادشاہ سے ہم کلام ہوتا تھا۔ اور جب ادنیٰ طبقہ کا کوئی آدمی شاہی مخاطبہ کے لیے بلایا جاتا تو وہ نیچے کھڑا رہتا اور بادشاہ تیسری سیڑھی تک اتر کر اس سے بات کرتا۔ یوسف اس قاعدے کے مطابق نیچے کھڑا ہوا اور زمین بوس ہو کر اس نے بادشاہ کو سلامی دی اور بادشاہ نے تیسری سیڑھی تک اتر کر اس سے گفتگو کی۔" اس تصویر میں بنی اسرائیل نے اپنے جلیل القدر پیغمبر کو جتنا گرا کر پیش کیا ہے اس کو نگاہ میں رکھیے اور پھر دیکھیے کہ قرآن اُن کے قید سے نکلنے اور بادشاہ سے ملنے کا واقعہ کس شان اور کس آن بان کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ اب یہ فیصلہ کرنا ہر صاحب نظر کا اپنا کام ہے کہ ان دونوں تصویروں میں سے کونسی تصویر پیغمبری کے مرتبے سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔ علاوہ بریں یہ بات بھی عقل عام کو کھٹکتی ہے کہ اگر بادشاہ کی ملاقات کے وقت تک حضرت یوسف کی حیثیت مصر میں اتنی ہی گری ہوئی تھی جتنی تلمود کے بیان سے معلوم ہوتی ہے تو خواب کی تعبیر سنتے ہی یکایک ان کو تمام سلطنت کا مختار کل کیسے بنا دیا گیا۔ ایک مہذب و متمدن ملک میں اتنا بڑا مرتبہ تو آدمی کو اسی وقت ملا کرتا ہے جب کہ وہ اپنی اخلاقی و ذہنی برتری کا سکہ لوگوں پر بٹھا چکا ہو۔ پس عقل کی رو سے بھی بائیبل اور تلمود کی بہ نسبت قرآن ہی کا بیان زیادہ مطابق حقیقت معلوم ہوتا ہے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [۵۰] یعنی جہاں تک میرے رب کا معاملہ ہے، اس کو تو پہلے ہی میری بیگناہی کا حال معلوم ہے، مگر تمھارے رب کو بھی میری رہائی سے پہلے اس معاملہ کی پوری طرح تحقیق کر لینی چاہیے جس کی بنا پر مجھے جیل میں ڈالا گیا تھا، کیونکہ میں کسی شبہہ اور کسی بدگمانی کا داغ لیے ہوئے خلق کے سامنے نہیں آنا چاہتا۔ مجھے رہا کرنا ہے تو پہلے برسر عام یہ ثابت ہونا چاہیے کہ
(باقی صفحہ ۱۶ پر)

بادشاہ نے ان عورتوں سے دریافت کیا[۵۲] "تمہارا کیا تجربہ ہے اس وقت کا جب تم نے یوسف کو رجھانے کی کوشش کی تھی؟" سب نے یک زبان ہو کر کہا "حاشاللہ، ہم نے تو اس میں بدی کا شائبہ تک نہ پایا۔" عزیز کی بیوی بول اٹھی "اب حق کھل چکا ہے، وہ میں ہی تھی جس نے اس کو پھسلانے کی کوشش کی تھی، بے شک وہ بالکل سچا ہے[۵۳]"

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۵) میں بے قصور تھا۔ اصل قصور وار تمہاری سلطنت کے کار فرما اور کارپرداز تھے جنھوں نے اپنی بیگمات کی بداطواری کا خمیازہ میری پاک دامنی پر ڈالا۔ اس مطالبے کو حضرت یوسفؑ جن الفاظ میں پیش کرتے ہیں ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شاہ مصر اس پورے واقعہ سے پہلے ہی واقف تھا جو بیگم عزیز کی دعوت کے موقع پر پیش آیا تھا، بلکہ وہ ایسا مشہور واقعہ تھا کہ اس کی طرف صرف ایک اشارہ ہی کافی تھا۔ پھر اس مطالبہ میں حضرت یوسف عزیز مصر کی بیوی کو چھوڑ کر صرف ہاتھ کاٹنے والی عورتوں کے ذکر پر اکتفا فرماتے ہیں۔ یہ اُن کی انتہائی شرافت نفس کا ایک اور ثبوت ہے۔ اس عورت نے ان کے ساتھ خواہ کتنی ہی برائی کی ہو، مگر پھر بھی اس کا شوہر اُن کا محسن تھا اس لیے انھوں نے نہ چاہا کہ اس کے ناموس پر خود کوئی حرف لائیں۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۵۲] ممکن ہے کہ شاہی محل میں ان تمام خواتین کو جمع کر کے یہ شہادت لی گئی ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ بادشاہ نے کسی معتمد خاص کو بھیج کر فرداً فرداً ان سے دریافت کرایا ہو۔

[۵۳] اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان شہادتوں نے کس طرح آٹھ نو سال پہلے کے واقعات کو تازہ کر دیا ہوگا، کس طرح حضرت یوسفؑ کی شخصیت زمانۂ قید کی طویل گمنامی سے نکل کر یکایک سطح پر آ گئی ہوگی، اور کس طرح مصر کے تمام اشراف معززین، متوسطین اور عوام تک میں آپ کا اخلاقی وقار قائم ہو گیا ہوگا۔ اوپر بائیبل اور تلمود کے حوالے سے یہ بات گزر چکی ہے کہ بادشاہ نے اعلان عام کر کے تمام مملکت کے دانشمندوں اور علما اور پیروں کو جمع کیا تھا اور وہ سب اس کے خواب کا مطلب بیان کرنے سے عاجز ہو چکے تھے، اور حضرت یوسفؑ نے اس کا مطلب بتا دیا۔ اس بنا پر پہلے ہی سارے ملک کی نگاہیں آپ کی ذات پر مرکوز ہو چکی ہوں گی۔ پھر جب بادشاہ کی طلبی پر آپ نے قید خانے سے انکار کیا ہوگا تو سارے لوگ اچنبھے میں پڑ گئے ہوں گے کہ یہ عجیب قسم کا بلند حوصلہ انسان ہے جس کو آٹھ نو برس کی قید کے بعد بادشاہ وقت مہربان ہو کر بلا رہا ہے اور پھر بھی وہ بے تاب ہو کر باہر نہیں نکل آتا۔ پھر جب لوگوں کو معلوم ہوا ہوگا کہ یوسف نے اپنی رہائی قبول کرنے اور بادشاہ وقت کی ملاقات کو آنے کے لیے کیا شرط پیش کی ہے تو سب کی نگاہیں اس تحقیقات کے

(باقی صفحہ ۱۷ پر)

(یوسف نے کہا)[۵] "اس سے میری غرض یہ تھی کہ (عزیز) یہ جان لے کہ میں نے درپردہ اس کی خیانت

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۹۱) نیچے پر لگ گئی ہوں گی۔ اور جب لوگوں نے اس کا نتیجہ سنا ہو گا تو ملک کا بچہ بچہ عش عش کرتا رہ گیا ہو گا کہ کس قدر پاکیزہ سیرت کا ہے یہ انسان جس کی طہارت نفس پر آج وہی لوگ گواہی دے رہے ہیں جنھوں نے مل جُل کر اسے جیل میں ڈالا تھا۔ اس صورت حال پر اگر غور کیا جائے تو اچھی طرح سمجھ میں آجاتا ہے کہ اُس وقت حضرت یوسف کے بام عروج پر پہنچنے کے لیے فضا پوری طرح سازگار ہو چکی تھی، اور اس کے بعد یہ بات کچھ بھی قابل تعجب نہیں رہتی کہ حضرت یوسف نے بادشاہ سے ملاقات کے موقع پر خزائن ارض کی سپردگی کا مطالبہ کیسے بے دھڑک پیش کر دیا اور بادشاہ نے اسے کیوں بے تامل قبول کر لیا۔ اگر بات صرف اسی قدر ہوتی کہ جیل کے ایک قیدی نے بادشاہ کے ایک خواب کی تعبیر بتا دی تھی تو ظاہر ہے کہ اس پر وہ زیادہ سے زیادہ کسی انعام کا اور خلاصی پا جانے کا مستحق ہو سکتا تھا۔ اتنی سی بات اس کے لیے تو کافی نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ بادشاہ سے کہے "خزائن ارض میرے حوالہ کرو" اور بادشاہ کہے "لیجیے، سب کچھ حاضر ہے"۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [۵] یہ بات غالباً حضرت یوسفؑ نے اس وقت کہی ہوگی جب قید خانہ میں آپ کو تحقیقات کے نتیجے کی خبر دی گئی ہو گی۔ بعض مفسرین، جن میں ابن تیمیہ اور ابن کثیر جیسے فضلا بھی شامل ہیں، اس فقرے کو حضرت یوسف کا نہیں بلکہ عزیز کی بیوی کے قول کا ایک حصہ قرار دیتے ہیں۔ اُن کی دلیل یہ ہے کہ یہ فقرہ امرأة العزیز کے قول سے متصل آیا ہے اور بیچ میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جس سے یہ سمجھا جائے کہ "اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ" پر امرأة العزیز کی بات ختم ہو گئی اور بعد کا کلام حضرت یوسف کی زبان سے ادا ہوا۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر دو آدمیوں کے قول ایک دوسرے سے متصل واقع ہوں اور اس امر کی صراحت نہ ہو کہ یہ قول فلاں کا ہے اور یہ فلاں کا، تو اس صورت میں لازماً کوئی قرینہ ایسا ہونا چاہیے جس سے دونوں کے کلام میں فرق کیا جا سکے، اور یہاں ایسا کوئی قرینہ موجود نہیں ہے اس لیے یہی ماننا پڑے گا کہ الْـٰٔنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ سے لے کر اِنَّ رَبِّيْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ تک پورا کلام امرأة العزیز کا ہے۔ لیکن مجھے تعجب ہے کہ ابن تیمیہ جیسے دقیقہ رس آدمی تک کی نگاہ سے یہ بات کیسے چوک گئی کہ شان کلام بجائے خود ایک بہت بڑا قرینہ ہے جس کے ہوتے کسی اور قرینہ کی ضرورت نہیں رہتی۔ پہلا فقرہ تو بلاشبہ امرأة العزیز کے منہ پر پھبتا ہے، مگر کیا دوسرا فقرہ بھی اس کی حیثیت کے مطابق نظر آتا ہے؟ یہاں تو شان کلام صاف کہہ رہی ہے کہ اس کے قائل

(باقی صفحہ ۱۸ پر)

نہیں کی تھی، اور یہ کہ جو خیانت کرتے ہیں اُن کی چالوں کو اللہ کامیابی کی راہ پر نہیں لگاتا۔ میں کچھ اپنے نفس کی براءت نہیں کر رہا ہوں، نفس تو بدی پر اکساتا ہی ہے الا یہ کہ کسی پر میرے رب کی رحمت ہو، بے شک میرا رب بڑا غفور و رحیم ہے"۔

بادشاہ نے کہا "انھیں میرے پاس لاؤ کہ میں ان کو اپنے لیے مخصوص کر لوں"۔

جب یوسف نے اس سے گفتگو کی تو اس نے کہا "اب آپ ہمارے ہاں قدر و منزلت رکھتے ہیں اور آپ کی امانت پر پورا بھروسا ہے"۔ یوسف نے کہا "ملک کے خزانے میرے سپرد کیجیے، میں حفاظت کرنے والا بھی ہوں اور علم بھی رکھتا ہوں"[۵۱]۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۷) حضرت یوسف ہیں نہ کہ عزیزِ مصر کی بیوی۔ اس کلام میں جو نیک نفسی، جو عالی ظرفی، جو فروتنی اور جو خدا ترسی بول رہی ہے وہ خود گواہ ہے کہ یہ فقرہ اُس زبان سے نکلا ہوا نہیں ہو سکتا جس سے ھیت لک نکلا تھا، جس سے ما جزاء من اراد باھلک سوءًا نکلا تھا، اور جس سے بھری محفل کے سامنے یہ تک نکل سکتا تھا کہ لئن لم یفعل ما اٰمرہ لیسجنن، بلکہ ایسا پاکیزہ فقرہ وہی زبان بول سکتی تھی جو اس سے پہلے معاذ اللہ انہ ربی احسن مثوای کہہ چکی تھی، جو رب السجن احب الی مما یدعوننی الیہ کہہ چکی تھی، جو الا تصرف عنی کیدھن اصب الیھن کہہ چکی تھی۔ ایسے پاکیزہ کلام کو یوسفِ صدیق کے بجائے امرأۃ العزیز کا کلام ماننا اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک کوئی قرینہ اس امر پر دلالت نہ کرے کہ اس مرحلے پر پہنچ کر اسے توبہ اور ایمان اور اصلاحِ نفس کی توفیق نصیب ہو گئی تھی۔ اور افسوس ہے کہ ایسا کوئی قرینہ موجود نہیں ہے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [۵۱] اس سے پہلے جو توضیحات گذر چکی ہیں ان کی روشنی میں دیکھا جائے تو صاف نظر آئے گا کہ یہ کوئی نوکری کی درخواست نہیں تھی جو کسی طالبِ جاہ نے وقت کے بادشاہ کو اپنے اوپر مہربان دیکھ کر جھٹ سے پیش کر دی ہو، بلکہ درحقیقت یہ اُس انقلاب کا دروازہ کھولنے کے لیے آخری ضرب تھی جو حضرت یوسف کی اخلاقی طاقت سے پچھلے دس بارہ سال کے اندر نشوونما پا کر ظہور کے لیے تیار ہو چکا تھا اور اب جس کا فتح باب صرف ایک ٹھوکے ہی کا محتاج تھا۔ حضرت یوسفؑ آزمائشوں کے ایک طویل سلسلے گذر کر آ رہے تھے اور یہ آزمائشیں کسی گمنامی کے گوشے میں پیش نہیں آئی تھیں بلکہ بادشاہ سے لے کر عام شہریوں تک مصر کا بچہ بچہ ان سے واقف تھا۔ ان آزمائشوں میں انھوں نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ امانت

(باقی صفحہ ۱۹ پر)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۹) راستبازی، حلم، ضبط نفس، عالی ظرفی، ذہانت و فراست اور معاملہ فہمی میں کم از کم اپنے زمانہ کے لوگوں کے درمیان تو اپنا نظیر نہیں رکھتے۔ ان کی شخصیت کے یہ اوصاف اس طرح کھل چکے تھے کہ کسی کو ان سے انکار کی مجال نہ رہی تھی۔ زبانیں ان کی شہادت دے چکی تھیں۔ دل ان سے مسحور ہو چکے تھے۔ اور خود بادشاہ ان کے آگے ہتھیار ڈال چکا تھا۔ اُن کا "حفیظ" اور "علیم" ہونا اب محض ایک دعویٰ نہ تھا بلکہ ایک ثابت شدہ واقعہ تھا جس پر سب ایمان لا چکے تھے۔ اب اگر کچھ کسر باقی تھی تو وہ صرف یہ تھی کہ حضرت یوسف خود حکومت کے اُن اختیارات کو اپنے ہاتھ میں لینے کے لیے آمادگی ظاہر کریں جن کے لیے بادشاہ اور اس کے اعیان سلطنت اپنی جگہ بخوبی جان چکے تھے کہ ان سے زیادہ موزوں آدمی اور کوئی نہیں ہے۔ چنانچہ یہی وہ کسر تھی جو انھوں نے اپنے اس فقرے سے پوری کر دی۔ ان کی زبان سے اس مطالبے کے نکلتے ہی بادشاہ اور اس کی کونسل نے جس طرح اسے بسروچشم قبول کیا وہ خود اس بات کا ثبوت ہے کہ پھل اتنا پک چکا تھا کہ اب ٹوٹنے کے لیے ایک اشارے ہی کا منتظر تھا۔ (تلمود کا بیان ہے کہ حضرت یوسف کو حکومت کے اختیارات سونپنے کا فیصلہ تنہا بادشاہ ہی نے نہیں کیا تھا بلکہ پوری شاہی کونسل نے بالاتفاق اس کے حق میں رائے دی تھی)۔

یہ اختیارات جو حضرت یوسف نے مانگے اور ان کو سونپے گئے ان کی نوعیت کیا تھی؟ ناواقف لوگ یہاں خزائن ارض کے الفاظ اور آگے چل کر غلہ کی تقسیم کا ذکر دیکھ کر قیاس کرتے ہیں کہ شاید یہ افسر خزانہ، یا افسر مال، یا قحط کمشنر، یا وزیر مالیات، یا وزیر غذائیات کی قسم کا کوئی عہدہ ہوگا۔ لیکن قرآن، توراۃ، اور تلمود کی متفقہ شہادت ہے کہ در حقیقت حضرت یوسف سلطنت مصر کے مختار کل (رومی اصطلاح میں ڈکٹیٹر) بنائے گئے تھے اور ملک کا سیاہ و سپید سب کچھ ان کے اختیار میں دے دیا گیا تھا۔ قرآن کہتا ہے کہ جب حضرت یعقوبؑ مصر پہنچے ہیں تو اس وقت حضرت یوسف تخت نشین تھے (ورفع ابویہ علی العرش)۔ خود حضرت یوسف کی زبان سے یہ دعا قرآن میں منقول ہے کہ "اے میرے رب تو نے مجھے بادشاہی عطا کی" (رب قد اٰتیتنی من الملک)۔ اور اللہ تعالیٰ مصر پر ان کے اقتدار کی کیفیت یہ بیان فرماتا ہے کہ ساری سرزمین مصر ان کی تھی (یتبوأ منھا حیث یشاء)۔ رہی توراۃ تو وہ شہادت دیتی ہے کہ فرعون نے یوسف سے کہا:

> "تو میرے گھر کا مختار ہوگا اور میری ساری رعایا تیرے حکم پر چلے گی فقط تخت کا مالک ہونے کے سبب سے میں بزرگ تر ہوں گا ...... دیکھ میں تجھے سارے ملک مصر کا حاکم بناتا ہوں ......
>
> اور تیرے حکم کے بغیر کوئی آدمی اس سارے ملک مصر میں اپنا ہاتھ یا پاؤں نہ ہلانے پائے گا۔ اور فرعون

(باقی صفحہ ۲۰ پر)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۹) نے یوسف کا نام صفنات فعنیح (دنیا کا نجات دہندہ) رکھا۔" (پیدائش ۴۱: ۳۹-۴۵)

اور تلمود کہتی ہے کہ یوسف کے بھائیوں نے مصر سے واپس جا کر اپنے باپ سے حاکم مصر (یوسف) کی تعریف کرتے ہوئے بیان کیا:

"اپنے ملک کے باشندوں پر اس کا اقتدار سب سے بالا ہے۔ اس کے حکم پر وہ نکلتے اور اسی کے حکم پر وہ داخل ہوتے ہیں۔ اس کی زبان سارے ملک پر فرمانروائی کرتی ہے۔ کسی معاملہ میں فرعون کے اذن کی ضرورت نہیں ہوتی۔"

دوسرا سوال یہ ہے کہ حضرت یوسف نے یہ اختیارات کس غرض کے لیے مانگے تھے؟ کیا انھوں نے اپنی خدمات اس لیے پیش کی تھیں کہ ایک کافر حکومت کے نظام کو اس کے کافرانہ اصول و قوانین ہی پر چلائیں؟ یا ان کے پیش نظر یہ تھا کہ حکومت کا اقتدار اپنے ہاتھ میں لے کر ملک کے نظام تمدن و اخلاق و سیاست کو اسلام کے مطابق ڈھال دیں؟ اس سوال کا بہترین جواب وہ ہے جو علامہ زمخشری نے اپنی تفسیر "کشاف" میں دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"حضرت یوسف نے اجعلنی علی خزائن الارض جو فرمایا تو اس سے ان کی غرض صرف یہ تھی کہ ان کو اللہ تعالیٰ کے احکام جاری کرنے اور حق قائم کرنے اور عدل پھیلانے کا موقع مل جائے اور وہ اُس کام کو انجام دینے کی طاقت حاصل کر لیں جس کے لیے انبیاء بھیجے جاتے ہیں۔ انھوں نے بادشاہی کی محبت اور دنیا کے لالچ میں یہ مطالبہ نہیں کیا تھا بلکہ یہ جانتے ہوئے کیا تھا کہ کوئی دوسرا شخص ان کے سوا ایسا نہیں ہے جو اس کام کو انجام دے سکے۔"

اور سچ یہ ہے کہ یہ سوال دراصل ایک اور سوال پیدا کرتا ہے جو اس سے بھی زیادہ اہم اور بنیادی سوال ہے۔ وہ یہ ہے کہ حضرت یوسف آیا پیغمبر بھی تھے یا نہیں؟ اگر پیغمبر تھے تو کیا قرآن میں ہم کو پیغمبری کا یہی تصور ملتا ہے کہ اسلام کا داعی خود نظام کفر کو کافرانہ اصولوں پر چلانے کے لیے اپنی خدمات پیش کرے؟ بلکہ یہ سوال اس پر بھی ختم نہیں ہوتا، اس سے بھی زیادہ نازک اور سخت ایک دوسرے سوال پر جا کر ٹھیرتا ہے، یعنی یہ کہ حضرت یوسف ایک راستباز آدمی بھی تھے یا نہیں؟ اگر راستباز تھے تو کیا ایک راستباز انسان کا یہی کام ہے کہ قید خانے میں تو وہ اپنی پیغمبرانہ دعوت کا آغاز اس سوال سے کرے کہ "بہت سے رب بہتر ہیں یا وہ ایک اللہ جو سب پر غالب ہے؟" اور بار بار اہل مصر پر بھی واضح کر دے کہ تمھارے

(باقی صفحہ ۲۱ پر)

اس طرح ہم نے اس سرزمین میں یوسف کے لیے اقتدار کی راہ ہموار کی۔ وہ مختار تھا کہ اس میں جہاں چاہے اپنی جگہ بنائے[۵۶]۔ ہم اپنی رحمت سے جس کو چاہتے ہیں نوازتے ہیں، نیک لوگوں کا اجر ہمارے ہاں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰) ان بہت سے "متفرق خود ساختہ خداؤں" میں سے ایک خدا شاہِ مصر بھی ہے، اور صاف صاف اپنے مشن کا بنیادی عقیدہ یہ بیان کرے کہ "فرمانروائی کے اختیارات خدائے واحد کے سوا کسی کے لیے نہیں ہیں"، مگر جب عملی آزمائش کا وقت آئے تو وہی شخص خود اُس نظامِ حکومت کا خادم، بلکہ ناظم اور حافظ اور پشت پناہ تک بن جائے جو شاہِ مصر کی ربوبیت میں چل رہا تھا اور جس کا بنیادی نظریہ "فرمانروائی کے اختیارات خدا کے لیے نہیں بلکہ بادشاہ کے لیے ہیں" تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ اس مقام کی تفسیر میں دورِ انحطاط کے مسلمانوں نے کچھ اُسی ذہنیت کا اظہار کیا ہے جو کبھی یہودیوں کی خصوصیت تھی۔ یہ یہودیوں کا حال تھا کہ جب وہ ذہنی و اخلاقی پستی میں مبتلا ہوئے تو پچھلی تاریخ میں جن جن بزرگوں کی سیرتیں ان کو بلندی پر چڑھنے کا سبق دیتی تھیں ان سب کو وہ نیچے گرا کر اپنے مرتبے پر اتار لائے تاکہ اپنے لیے اور زیادہ نیچے گرنے کا بہانہ پیدا کریں۔ افسوس کہ یہی کچھ اب مسلمان بھی کر رہے ہیں۔ انھیں کافر حکومتوں کی چاکری کرنی ہے۔ مگر اس پستی میں گرتے ہوئے اسلام اور اس کے علمبرداروں کی بلندی دیکھ کر انھیں شرم آتی ہے۔ لہٰذا اس شرم کو مٹانے اور اپنے ضمیر کو راضی کرنے کے لیے یہ اپنے ساتھ اُس جلیل القدر پیغمبر کو بھی خدمتِ کفر کی گہرائی میں لے گرنا چاہتے ہیں جس کی زندگی دراصل انھیں یہ سبق دے رہی تھی کہ اگر کسی ملک میں ایک اور صرف ایک مردِ مومن بھی خالص اسلامی اخلاق اور ایمانی فراست و حکمت کا حامل ہو تو وہ تن تنہا مجرد اپنے اخلاق اور اپنی حکمت کے زور سے اسلامی انقلاب برپا کر سکتا ہے اور یہ کہ مومن کی اخلاقی طاقت (بشرطیکہ وہ اس کا استعمال جانتا ہو اور اسے استعمال کرنے کا ارادہ بھی رکھتا ہو) فوج اور اسلحہ اور سروسامان کے بغیر بھی ملک فتح کر سکتی ہے اور سلطنتوں کو مسخر کر لیتی ہے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [۵۶] یعنی اب ساری سرزمینِ مصر اس کی تھی۔ اس کی ہر جگہ کو وہ اپنی جگہ کہہ سکتا تھا۔ وہاں کوئی گوشہ بھی ایسا نہ رہا تھا جو اس سے روکا جا سکتا ہو۔ یہ گویا اس کامل تسلط اور ہمہ گیر اقتدار کا بیان ہے جو حضرت یوسف کو اس ملک پر حاصل تھا۔ قدیم مفسرین بھی اس آیت کی یہی تفسیر کرتے ہیں، چنانچہ ابن زید کے حوالہ سے علامہ ابن جریر طبری نے اپنی تفسیر میں اس کے معنی یہ بیان کیے ہیں کہ "ہم نے یوسف کو ان سب چیزوں کا مالک بنا دیا جو مصر میں تھیں۔ دنیا کے اس حصہ میں وہ جہاں جو کچھ چاہتا کر سکتا تھا۔ وہ سرزمین اس کے حوالہ کر دی گئی تھی، حتیٰ کہ اگر وہ چاہتا کہ فرعون کو

(باقی صفحہ ۲۲ پر)

مارا نہیں جاتا، اور آخرت کا اجر ان لوگوں کے لیے زیادہ بہتر ہے جو ایمان لائے اور خدا ترسی کے ساتھ کام کرتے رہے۔[1]

یوسف کے بھائی مصر آئے اور اس کے ہاں حاضر ہوئے۔[2] اس نے انھیں پہچان لیا مگر وہ اس سے ناآشنا تھے۔[3] جب اس نے ان کا سامان لدوا دیا تو کہا "اپنے سوتیلے بھائی کو میرے پاس

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۲) اپنا زبردست کرے اور خود اس سے بالاتر ہو جائے تو یہ بھی کر سکتا تھا" دوسرا قول علامہ موصوف نے مجاہد کا نقل کیا ہے جو مشہور ائمہ تفسیر میں سے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ بادشاہ مصر نے یوسف کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا تھا۔

(حواشی صفحہ ہذا) [1] یہ تنبیہ ہے اس امر پر کہ کوئی شخص دنیوی حکومت و اقتدار کو نیکی و نکوکاری کا اصلی اجر اور حقیقی اجر مطلوب نہ سمجھ بیٹھے بلکہ خبردار رہے کہ بہترین اجر اور وہ اجر جو مومن کو مطلوب ہونا چاہیے وہ ہے جو اللہ تعالیٰ آخرت میں عطا فرمائے گا۔

[2] یہاں پھر سات آٹھ برس کے واقعات درمیان میں چھوڑ کر سلسلۂ بیان اس جگہ سے جوڑ دیا گیا ہے جہاں سے بنی اسرائیل کے مصر منتقل ہونے اور حضرت یعقوب کو اپنے گم شدہ صاحبزادے کا پتہ ملنے کی ابتدا ہوتی ہے۔ بیچ میں جو واقعات چھوڑ دیے گئے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ خواب والی پیش خبری کے مطابق حضرت یوسف کی حکومت کے پہلے سات سال مصر میں انتہائی خوشحالی کے گزرے اور ان ایام میں انھوں نے آنے والے قحط کے لیے وہ تمام پیش بندیاں کریں جن کا مشورہ بادشاہ کے خواب کی تعبیر بتاتے وقت وہ دے چکے تھے۔ اس کے بعد قحط کا دور شروع ہوا اور یہ قحط صرف مصر ہی میں نہ تھا بلکہ آس پاس کے ممالک بھی اس کی لپیٹ میں آگئے تھے۔ شام، فلسطین، شرق اردن، شمالی عرب، سب جگہ خشک سالی کا دور دورہ تھا۔ ان حالات میں حضرت یوسف کے دانشمندانہ انتظام کی بدولت صرف مصر ہی وہ ملک تھا جہاں قحط کے باوجود غلہ کی افراط تھی۔ اس لیے تمام ہمسایہ ممالک کے لوگ مجبور ہوئے کہ غلہ حاصل کرنے کے لیے مصر کی طرف رجوع کریں۔ یہی وہ موقع تھا جب فلسطین سے حضرت یوسف کے بھائی غلہ خریدنے کے لیے مصر پہنچے۔ غالباً حضرت یوسف نے غلہ کی اس طرح ضابطہ بندی کی ہوگی کہ بیرونی ممالک میں خاص اجازت ناموں کے بغیر اور خاص مقدار سے زیادہ غلہ نہ جا سکتا ہوگا۔ اس وجہ سے جب برادران یوسف نے غیر ملک سے آکر غلہ حاصل کرنا چاہا ہوگا تو انھیں اس کے لیے خاص اجازت نامہ طلب کرنے کی ضرورت پیش آئی ہوگی اور اس طرح حضرت یوسف کے سامنے ان کی پیشی کی نوبت آئی ہوگی۔

[3] برادران یوسف کا آپ کو نہ پہچاننا کچھ بعید از قیاس نہیں ہے۔ جس وقت انھوں نے آپ کو کنویں میں پھینکا تھا اس وقت آپ صرف سترہ سال کے لڑکے تھے۔ اور اب آپ کی عمر ۴۰ سال کے لگ بھگ تھی۔ اتنی طویل مدت

(باقی صفحہ ۲۳ پر)

لانا، دیکھتے نہیں ہو کہ میں کس طرح پیمانہ بھر کر دیتا ہوں اور کیسا اچھا مہمان نواز ہوں، اگر تم اسے نہ لاؤ گے تو میرے پاس تمہارے لیے کوئی غلہ نہیں ہے بلکہ تم میرے قریب بھی نہ پھٹکنا۔[۵۵] انھوں نے کہا "ہم کوشش کریں گے کہ والد صاحب اسے بھیجنے پر راضی ہو جائیں، اور ہم ایسا ضرور کریں گے"۔ یوسف نے اپنے غلاموں کو

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۲) آدمی کو بہت کچھ بدل دیتی ہے۔ پھر یہ توان کے سان دگمان میں بھی نہ تھا کہ جس بھائی کو وہ کنوئیں میں پھینک گئے تھے وہ آج مصر کا مختار مطلق ہوگا۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) ۵۵۔ اختصار بیان کی وجہ سے شاید کسی کو یہ سمجھنے میں دقت ہو کہ حضرت یوسف جب اپنی شخصیت کو ان پر ظاہر نہ کرنا چاہتے تھے تو پھر ان کے سوتیلے بھائی کا ذکر کیسے آگیا اور اس کو لانے پر اس قدر اصرار کرنے کے کیا معنی تھے، کیونکہ اس طرح تو راز فاش ہوا جاتا تھا۔ لیکن تھوڑا سا غور کرنے سے بات صاف سمجھ میں آجاتی ہے۔ وہاں غلے کی ضابطہ بندی تھی اور ہر شخص ایک مقرر مقدار غلہ ہی لے سکتا تھا۔ غلہ لینے کے لیے یہ دس بھائی آئے تھے، مگر وہ اپنے والد اور اپنے گیارھویں بھائی کا حصہ بھی مانگتے ہوں گے۔ اس پر حضرت یوسف نے کہا ہوگا کہ تمہارے والد کے خود نہ آنے کے لیے تو یہ عذر معقول ہو سکتا ہے کہ وہ بہت بوڑھے اور نابینا ہیں مگر بھائی کے نہ آنے کا کیا معقول سبب ہو سکتا ہے؟ کہیں تم ایک فرضی نام سے زائد غلہ حاصل کرنے اور پھر ناجائز تجارت کرنے کی کوشش تو نہیں کر رہے ہو؟ انھوں نے جواب میں اپنے گھر کے کچھ حالات بیان کیے ہوں گے اور بتایا ہوگا کہ وہ ہمارا سوتیلا بھائی ہے اور بعض وجوہ سے ہمارے والد اس کو ہمارے ساتھ بھیجنے میں تامل کرتے ہیں۔ تب حضرت یوسف نے فرمایا ہوگا کہ خیر، اس وقت تو ہم تمہاری زبان کا اعتبار کر کے تم کو پورا غلہ دیے دیتے ہیں مگر آئندہ اگر تم اس کو ساتھ نہ لائے تو تمہارا اعتبار جاتا رہے گا اور تمھیں یہاں سے کوئی غلہ نہ مل سکے گا۔ اس حاکمانہ دھمکی کے ساتھ آپ نے ان کو اپنے احسان اور اپنی مہمان نوازی سے بھی رام کرنے کی کوشش کی، کیونکہ دل اپنے چھوٹے بھائی کو دیکھنے کے لیے بے تاب تھا۔ یہ معاملہ کی ایک سادہ سی صورت ہے جو ذرا غور کرنے سے خود بخود سمجھ میں آجاتی ہے اور اس صورت میں بائیبل کی اس مبالغہ آمیز داستان پر اعتماد کرنے کی کوئی ضرورت نہیں رہتی جو کتاب پیدائش کے باب ۴۲ - ۴۴ میں بڑی رنگ آمیزی کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔)

اشارہ کیا کہ "ان لوگوں نے غلے کے عوض جو مال دیا ہے وہ چپکے سے ان کے سامان ہی میں رکھ دو" اس امید پر کہ گھر پہنچ کر وہ پہچان جائیں گے اور عجب نہیں کہ پھر پلٹیں۔

جب وہ اپنے باپ کے پاس واپس گئے تو کہا "ابا جان، آئندہ ہم کو غلہ دینے سے انکار کر دیا گیا ہے، لہٰذا آپ ہمارے بھائی کو ہمارے ساتھ بھیج دیجیے تاکہ ہم غلہ لے کر آئیں اور اس کی حفاظت کے ہم ذمہ دار ہیں۔" باپ نے جواب دیا "کیا میں اس کے معاملہ میں تم پر ویسا ہی بھروسہ کروں جیسا اس سے پہلے اس کے بھائی کے معاملہ میں کر چکا ہوں؟ اللہ ہی بہتر محافظ ہے اور وہ سب سے بڑھ کر رحم فرمانے والا ہے۔" پھر جب انھوں نے اپنا سامان کھولا تو دیکھا کہ ان کا مال بھی انھیں واپس کر دیا گیا ہے۔ یہ دیکھ کر وہ پکار اٹھے "ابا جان، اور ہمیں کیا چاہیے، دیکھیے یہ ہمارا مال بھی ہمیں واپس دیدیا گیا ہے۔ بس ہم اب جائیں گے اور اپنے اہل و عیال کے لیے رسد لے آئیں گے۔ اپنے بھائی کی حفاظت بھی کریں گے اور ایک بار شتر اور زیادہ بھی لے آئیں گے، اتنے غلہ کا اضافہ آسانی کے ساتھ ہو جائے گا۔" ان کے باپ نے کہا "میں اس کو ہرگز تمہارے ساتھ نہ بھیجوں گا جب تک کہ تم اللہ کے نام سے مجھ کو پیمان نہ دیدو کہ اسے میرے پاس ضرور واپس لے کر آؤ گے الا یہ کہ کہیں تم گھیر ہی لیے جاؤ۔" جب انھوں نے اس کو اپنے اپنے پیمان دیدیے تو اس نے کہا "دیکھو، ہمارے اس قول پر اللہ نگہبان ہے۔" پھر اس نے کہا "میرے بچو، مصر کے دار السلطنت میں ایک دروازے سے داخل نہ ہونا بلکہ مختلف دروازوں سے جانا۔[ف] مگر اللہ کی مشیت سے میں تم کو بچا لینا مرے بس

ف اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یوسف کے بعد بھی ایک بیٹے کو بھیجتے وقت حضرت یعقوب کے دل پر کیا کچھ گذر رہی ہوگی۔ گو خدا پر بھروسہ تھا اور صبر و تسلیم میں ان کا مقام نہایت بلند تھا۔ مگر پھر بھی تھے تو انسان ہی۔ طرح طرح کے اندیشے دل میں آتے ہوں گے، اور رہ رہ کر اس خیال سے کانپ اٹھتے ہوں گے کہ خدا جانے اب اس لڑکے کی صورت بھی دیکھ سکوں گا یا نہیں۔ اسی لیے وہ چاہتے ہوں گے کہ اپنی حد تک احتیاط میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی جائے۔

ت یہ احتیاطی مشورہ کہ مصر کے دار السلطنت میں یہ سب بھائی ایک دروازے سے نہ جائیں، ان سیاسی حالات کا تصور کرنے سے صاف سمجھ میں آجاتا ہے جو اس وقت پائے جاتے تھے۔ یہ لوگ سلطنت مصر کی سرحد پر آزاد قبائلی علاقے کے رہنے والے تھے۔ اہل مصر اس علاقے کے لوگوں کو اسی شبہہ کی نگاہ سے دیکھتے ہوں گے جس نگاہ سے

(باقی صفحہ ۳۵ پر)

میں نہیں ہے۔ فرمانروائی کے اختیارات اللہ کے سوا کسی کے لیے نہیں ہیں، اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور بھروسہ کرنے والوں کو اسی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔" اور واقعہ بھی یہی ہوا کہ جب وہ اپنے باپ کی ہدایت کے مطابق شہر میں (متفرق دروازوں سے) داخل ہوئے تو اس کی یہ احتیاطی تدبیر اللہ کی مشیت کے مقابلہ میں کچھ بھی کام نہ آ سکی، ہاں بس یعقوب کے دل میں جو ایک کھٹک تھی اسے دور کرنے کے لیے اس نے اپنی سی کوشش کر لی۔ بے شک وہ ہماری دی ہوئی تعلیم سے صاحب علم تھا مگر اکثر لوگ معاملہ کی حقیقت کو
۶۸ جانتے نہیں ہیں۔[۵۵]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۱۴) آج ہندوستان کی حکومت آزاد سرحدی علاقے والوں کو دیکھتی ہے۔ حضرت یعقوب کو اندیشہ ہوا ہوگا کہ اس قحط کے زمانہ میں اگر یہ لوگ ایک جتھا بنے ہوئے وہاں داخل ہوں گے تو شاید انھیں مشتبہ سمجھا جائے اور یہ گمان کیا جائے کہ یہ یہاں لوٹ مار کی غرض سے آئے ہیں۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [۵۵] اس کا مطلب یہ ہے کہ تدبیر اور توکل کے درمیان یہ ٹھیک ٹھیک توازن جو تم حضرت یعقوب کے مذکورۂ بالا اقوال میں پاتے ہو، یہ دراصل علم حقیقت کے اس فیضان کا نتیجہ تھا جو اللہ تعالیٰ کے فضل سے ان پر ہوا تھا۔ ایک طرف وہ عالم اسباب کے قوانین کے مطابق تمام ایسی تدبیریں کرتے ہیں جو عقل و فکر اور تجربہ کی بنا پر اختیار کرنی ممکن تھیں، بیٹوں کو ان کا پہلا جرم یاد دلا کر زجر و تنبیہ کرتے ہیں تاکہ وہ دوبارہ ویسا ہی جرم کرنے کی جرأت نہ کریں۔ ان سے خدا کے نام پر عہد و پیمان لیتے ہیں کہ سوتیلے بھائی کی حفاظت کریں گے، اور وقت کے سیاسی حالات کو دیکھتے ہوئے جس احتیاطی تدبیر کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اسے بھی استعمال کرنے کا حکم دیتے ہیں تاکہ اپنی حد تک کوئی ظاہری سبب بھی ایسا نہ رہنے دیا جائے جو ان لوگوں کے گھر جانے کا موجب ہو۔ مگر دوسری طرف ہر آن یہ بات ان کے پیش نظر ہے اور اس کا بار بار اظہار کرتے ہیں کہ کوئی انسانی تدبیر اللہ کی مشیت کو نافذ ہونے سے نہیں روک سکتی، اور اصل حفاظت اللہ کی حفاظت ہے، اور بھروسا اپنی تدبیروں پر نہیں بلکہ اللہ ہی کے فضل پر ہونا چاہیے۔ یہ صحیح توازن اپنی باتوں میں اور اپنے کاموں میں صرف وہی شخص قائم کر سکتا ہے جو حقیقت کا علم رکھتا ہو۔ جو یہ بھی جانتا ہو کہ حیات دنیا کے ظاہری پہلو میں اللہ کی بنائی ہوئی فطرت انسان سے کس سعی و عمل کا تقاضا کرتی ہے، اور اس سے بھی واقف ہو کہ اس ظاہر کے پیچھے جو حقیقت نفس الامری پوشیدہ ہے اس کی

(باقی صفحہ ۲۲۲ پر)

یہ لوگ یوسف کے حضور پہنچے تو اس نے اپنے بھائی کو اپنے پاس الگ بلا لیا اور اسے بتادیا کہ
"میں تیرا وہی بھائی ہوں (جو کھویا گیا تھا)۔ اب ان باتوں کا غم نہ کر جو یہ لوگ کرتے رہے ہیں"[۵۶]۔
جب یوسف ان بھائیوں کا سامان لدوانے لگا تو اس نے اپنے بھائی کے سامان میں اپنا پیالہ رکھ دیا[۵۷]
پھر ایک پکارنے والے نے پکار کر کہا "اے قافلے والو! تم لوگ چور ہو"[۵۸]۔ انھوں نے پلٹ کر پوچھا "تمھاری کیا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۵) بنا پر اصل کارفرما طاقت کونسی ہے اور اس کے ہوتے ہوئے اپنی سعی و عمل پر انسان کا بھروسا کس قدر بے بنیاد ہے۔ یہی وہ بات ہے جس کو اکثر لوگ نہیں جانتے۔ ان میں سے جس کے ذہن پر ظاہر کا غلبہ ہوتا ہے وہ توکل سے غافل ہو کر تدبیر ہی کو سب کچھ سمجھتا ہے، اور جس کے دل پر باطن چھا جاتا ہے وہ تدبیر سے بے پروا ہو کر نرے توکل ہی کے بل پر زندگی کی گاڑی چلانا چاہتا ہے۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) ۵۶ اس فقرے میں وہ ساری داستان سمیٹ دی گئی ہے جو اکیس بائیس برس کے بعد دونوں ماں جائے بھائیوں کے ملنے پر پیش آئی ہوگی۔ حضرت یوسف نے بتایا ہوگا کہ وہ کن حالات سے گزرتے ہوئے اس مرتبے پر پہنچے۔ بن یمین نے سنایا ہوگا کہ ان کے پیچھے سوتیلے بھائیوں نے اس کے ساتھ کیا کیا بدسلوکیاں کیں۔ پھر حضرت یوسف نے بھائی کو تسلی دی ہوگی کہ اب تم میرے پاس ہی رہوگے، ان ظالموں کے پنجے میں تم کو دوبارہ نہیں جانے دوں گا۔ بعید نہیں کہ اسی موقع پر دونوں بھائیوں میں یہ بھی طے ہوگیا ہو کہ بن یمین کو مصر میں روک رکھنے کے لیے کیا تدبیر کی جائے جس سے وہ پردہ بھی پڑا رہے جو حضرت یوسف مصلحۃً ابھی ڈالے رکھنا چاہتے تھے۔

۵۷ پیالہ رکھنے کا فعل غالباً حضرت یوسف نے اپنے بھائی کی رضامندی سے اور اس کے علم میں کیا تھا جیسا کہ اس سے پہلے والی آیت اشارہ کر رہی ہے۔ حضرت یوسف کو بائیس برس کے بچھڑے ہوئے بھائی کی جدائی گوارا نہ ہوگی۔ بھائی خود بھی ان ظالموں کے ساتھ واپس جانا نہ چاہتا ہوگا۔ مگر علانیہ آپ کا اسے روکنا اور اس کا رک جانا بغیر اس کے ممکن نہ تھا کہ حضرت یوسف اپنی شخصیت کو ظاہر کریں، اور اس کا اظہار اس موقع پر مصلحت کے خلاف تھا۔ اس لیے دونوں بھائیوں میں مشورہ ہوا ہوگا کہ اسے روکنے کی یہ تدبیر کی جائے۔ اگرچہ تھوڑی دیر کے لیے اس میں بھائی کی سبکی تھی، کہ اس پر چوری کا دھبہ لگتا تھا، لیکن بعد میں یہ دھبہ اس طرح باسانی دھل سکتا تھا کہ دونوں بھائی اصل معاملہ کو دنیا پر ظاہر کردیں۔

۵۸ اس آیت میں، اور بعد والی آیات میں بھی کہیں ایسا کوئی اشارہ موجود نہیں ہے جس سے یہ گمان کیا جاسکے کہ حضرت یوسف نے اپنے ملازموں کو اس راز میں شریک کیا تھا اور انھیں خود یہ سکھایا تھا کہ قافلے والوں
(باقی صفحہ ۲۷ پر)

چیز کھوئی گئی ہے؟" سرکاری ملازموں نے کہا "بادشاہ کا پیمانہ ہم کو نہیں ملتا" (اور ان کے جمعدار نے کہا) "جو شخص لا کر دے گا اس کے لیے ایک بار شتر انعام ہے۔ اس کا میں ذمہ لیتا ہوں"۔ ان بھائیوں نے کہا "خدا کی قسم تم لوگ خوب جانتے ہو کہ ہم اس ملک میں فساد کرنے نہیں آئے ہیں اور ہم چوریاں کرنے والے لوگ نہیں ہیں"۔ انھوں نے کہا "اچھا، اگر تمھاری بات جھوٹ نکلی تو چور کی کیا سزا ہے؟" انھوں نے کہا "اس کی سزا؟ جس کے سامان میں سے چیز نکلے وہ آپ ہی اپنی سزا میں رکھ لیا جائے۔ ہمارے ہاں تو ظالموں کو سزا دینے کا یہی طریقہ ہے"[۵۵]۔ تب یوسف نے اپنے بھائی سے پہلے اُن کی خُرجیوں کی تلاشی لینی شروع کی، پھر اپنے بھائی کی خرجی سے گم شدہ چیز برآمد کر لی ——— اس طرح ہم نے یوسف کی تائید اپنی تدبیر سے کی[۵۶]۔ اُس کا یہ کام نہ تھا کہ بادشاہ کے دین (یعنی شاہ مصر کے قانون) میں اپنے بھائی کو پکڑتا الا یہ کہ اللہ ہی ایسا چاہے[۵۷]۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۶) جھوٹا الزام لگاؤ۔ واقعہ کی سادہ صورت جو سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ پیالہ خاموشی کے ساتھ رکھ دیا گیا ہوگا۔ بعد میں جب سرکاری ملازموں نے اسے نہ پایا ہوگا تو قیاس کیا ہوگا کہ ہو نہ ہو یہ کام انہی قافلے والوں میں سے کسی کا ہے جو یہاں ٹھیرے ہوئے

حواشی صفحہ ہذا) ۵۵ خیال رہے کہ یہ بھائی خاندان ابراہیمی کے افراد تھے، لہٰذا انھوں نے چوری کے معاملہ میں جو قانون بیان کیا وہ شریعت ابراہیمی کا قانون تھا۔

۵۶ یہ کونسی تدبیر ہے جو حضرت یوسف کی تائید میں براہ راست خدا کی طرف سے کی گئی؟ ظاہر ہے کہ پیالہ رکھنے کی تدبیر تو حضرت یوسف نے خود کی تھی۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ سرکاری ملازموں نے چوری کا شبہ کر کے قافلے والوں کو روکا، تو یہ بھی حسب معمول وہ کام تھا جو ایسے مواقع پر سب سرکاری ملازم کیا کرتے ہیں۔ پھر وہ کونسی تدبیر ہے جو اس سلسلہ واقعات میں براہ راست خداوند عالم کی طرف سے عمل میں لائی گئی؟ اوپر کی آیات میں تلاش کرنے سے اس کے سوا کسی دوسری چیز کو تدبیر خداوندی کا مصداق نہیں ٹھیرایا جاسکتا کہ سرکاری ملازموں نے خلاف معمول خود مشتبہ ملزموں سے چور کی سزا پوچھی، اور انھوں نے وہ سزا بتائی جو شریعت ابراہیمی کی رو سے چور کو دی جاتی تھی۔ بعد والی آیت بھی صاف بتا رہی ہے کہ خدائی تدبیر سے مراد یہی ہے۔

۵۷ یعنی یہ بات حضرت یوسف کی شان پیغمبری کے شایان نہ تھی کہ وہ اپنے ایک ذاتی معاملہ میں شاہ مصر کے قانون پر عمل کرتے۔ اپنے بھائی کو روک رکھنے کے لیے انھوں نے خود جو تدبیر کی تھی، اُس میں یہ خلل رہ گیا تھا کہ بھائی

(باقی صفحہ ۲۰ پر)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۷۷) کو روک تو ضرور جا سکتا تھا مگر شاہ مصر کے قانون تعزیرات سے کام لینا پڑتا، اور یہ اس پیغمبر کی شان کے مطابق نہ تھا جس نے اختیارات حکومت غیر اسلامی قوانین کی جگہ اسلامی شریعت نافذ کرنے کے لیے اپنے ہاتھ میں لیے تھے۔ اگر اللہ چاہتا تو اپنے نبی کو اس بدنما غلطی میں مبتلا ہو جانے دیتا، مگر اس نے یہ گوارا نہ کیا کہ یہ دھبہ اس کے دامن پر رہ جائے۔ اس لیے اس نے اپنی براہ راست تدبیر سے یہ راہ نکال دی کہ الٹا برادران یوسف سے چور کی سزا پوچھی گئی اور انھوں نے اس کے لیے شریعت ابراہیمی کا قانون بیان کر دیا ـــــ یہ چیز اس لحاظ سے بھی بالکل برمحل تھی کہ برادران یوسف مصری رعایا نہ تھے، ایک آزاد علاقے سے آئے ہوئے لوگ تھے، اس لیے بین الاقوامی ضابطۂ عمل کی رو سے ان پر خود انہی کے ہاں کا قانون جاری ہونا چاہیے تھا نہ کہ مصری قانون ـــــ یہی وہ چیز ہے جس کو بعد والی دو آیتوں میں اللہ تعالیٰ اپنے احسان اور اپنی علمی برتری سے تعبیر فرماتا ہے۔ ایک بندے کے لیے اس سے بڑھ کر بلندی درجہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ اگر وہ کبھی بشری کمزوری کی بنا پر خود کسی لغزش میں مبتلا ہو رہا ہو تو اللہ تعالیٰ غیب سے اس کو بچانے کا انتظام فرما دے۔ ایسا بلند مرتبہ صرف انہی لوگوں کو ملا کرتا ہے جو اپنی سعی و عمل سے بڑی بڑی آزمائشوں میں اپنا "محسن" ہونا ثابت کر چکے ہوتے ہیں۔ اور اگرچہ حضرت یوسف صاحب علم تھے، خود بہت دانشمندی کے ساتھ کام کرتے تھے، مگر پھر بھی اس موقع پر ان کے علم میں ایک کسر رہ ہی گئی اور اسے اس ہستی نے پورا کیا جو ہر صاحب علم سے بالاتر ہے۔

یہاں چند امور اور وضاحت طلب رہ جاتے ہیں جن پر ہم مختصر کلام کریں گے:

(۱) عام طور پر اس آیت کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ "یوسف بادشاہ کے قانون کی رو سے اپنے بھائی کو نہ پکڑ سکتا تھا" یعنی ماکان لیاخذ کو مترجمین و مفسرین عدم قدرت کے معنی میں لیتے ہیں نہ کہ عدم صحت اور عدم مناسبت کے معنی میں۔ لیکن اول تو یہ ترجمہ و تفسیر عربی محاورے اور قرآنی استعمالات دونوں کے لحاظ سے ٹھیک نہیں ہے، کیونکہ عربی میں عموماً ماکان لہ بمعنی ماینبغی لہ، ماصح لہ، مااستقام لہ وغیرہ آتا ہے اور قرآن میں بھی یہ زیادہ تر انہی معنی میں آیا ہے، مثلاً ماکان للہ ان یتخذ من ولد، ماکان لنا ان نشرک باللہ من شیء، ماکان اللہ لیطلعکم علی الغیب، ماکان اللہ لیضیع ایمانکم، فماکان اللہ لیظلمھم، ماکان اللہ لیذر المومنین علی ماانتم علیہ، ماکان لمومن ان یقتل مومناً۔ دوسرے اگر اس کے وہی معنی لیے جائیں جو مترجمین و مفسرین بالعموم بیان کرتے ہیں تو بات بالکل مہمل ہو جاتی ہے۔ بادشاہ کے قانون میں چور کو نہ پکڑ سکنے کی

(باقی صفحہ ۲۹ پر)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۸) آخر وجہ کیا ہو سکتی ہے؟ کیا دنیا میں کبھی کوئی سلطنت ایسی بھی رہی ہے جس کا قانون چور کو گرفتار کرنے کی اجازت نہ دیتا ہو؟

(۲) اللہ تعالیٰ نے شاہی قانون کے لیے "دین الملک" کا لفظ استعمال کر کے خود اس معنی کی طرف اشارہ فرما دیا ہے جو ما کان لیاخذ سے لیا جانا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ اللہ کا پیغمبر زمین میں "دین اللہ" جاری کرنے کے لیے مبعوث ہوا تھا نہ کہ "دین الملک" جاری کرنے کے لیے۔ اور اگر حالات کی مجبوری سے اُس کی حکومت میں اس وقت تک پوری طرح دین الملک کی جگہ دین اللہ جاری نہ ہو سکا تھا تب بھی کم از کم پیغمبر کا اپنا کام تو یہ نہ تھا کہ اپنے ایک شخصی معاملہ میں دین الملک پر عمل کرے۔ لہٰذا حضرت یوسف کا دین الملک کے مطابق اپنے بھائی کو نہ پکڑنا اس بنا پر نہیں ہو سکتا کہ دین الملک میں ایسا کرنے کی گنجائش ہی نہ تھی، بلکہ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ پیغمبر ہونے کی حیثیت سے اپنی ذاتی حد تک دین اللہ پر عمل کرنا ان کا فرض تھا اور دین الملک کی پیروی ان کے لیے قطعاً نامناسب تھی۔

(۳) قانونِ ملکی (Law of the land) کے لیے لفظ "دین" استعمال کر کے اللہ تعالیٰ نے معنی دین کی وسعت پوری طرح واضح کر دی ہے اور ان لوگوں کے تصورِ دین کی جڑ کاٹ دی ہے جو انبیاء علیہم السلام کی دعوت کو صرف عام مذہبی معنوں میں خدائے واحد کی پوجا کرانے اور محض چند مذہبی مراسم و عقائد کی پابندی کرا لینے تک محدود سمجھتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ انسانی تمدن، سیاست، معیشت، عدالت، قانون اور ایسے ہی دوسرے دنیوی امور کا کوئی تعلق دین سے نہیں ہے، یا اگر ہے بھی تو ان امور کے بارے میں دین کی ہدایات محض اختیاری سفارشات ہیں جن پر اگر عمل ہو جائے تو اچھا ہے، ورنہ انسانوں کے اپنے بنائے ہوئے اصول و ضوابط قبول کر لینے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ سراسر گمراہانہ تصورِ دین جس کا ایک مدت سے مسلمانوں میں چرچا ہے، جو بہت بڑی حد تک مسلمانوں کو اسلامی نظامِ زندگی کے قیام کی سعی سے غافل کرنے کا ذمہ دار ہے، جس کی بدولت مسلمان کفر و جاہلیت کے نظامِ زندگی پر نہ صرف راضی ہوئے بلکہ ایک نبی کی سنت سمجھ کر اس نظام کے پرزے بننے اور اس کو خود چلانے کے لیے بھی آمادہ ہو گئے ہیں، اِس آیت کی رو سے قطعاً غلط ثابت ہوتا ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ صاف بتا رہا ہے کہ جس طرح نماز، روزہ اور حج دین ہے اسی طرح وہ قانون بھی دین ہے جس پر سوسائٹی کا نظام اور ملک کا انتظام چلایا جاتا ہے۔ لہٰذا ان الدین عند اللہ الاسلام اور ومن یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منہ وغیرہ آیات میں جس دین کی اطاعت کا مطالبہ کیا گیا ہے

(باقی صفحہ ۳۰ پر)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۵) اس سے مراد صرف نماز روزہ ہی نہیں ہے بلکہ اسلام کا اجتماعی نظام بھی ہے جس سے ہٹ کر کسی دوسرے نظام کی پیروی خدا کے ہاں ہرگز مقبول نہیں ہو سکتی۔

(۲) سوال کیا جا سکتا ہے کہ اس سے کم از کم یہ تو ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت تک مصر کی حکومت میں "دین الملک" ہی جاری رہا تھا، اور اگر اس حکومت کے حاکم اعلیٰ حضرت یوسف ہی تھے، جیسا کہ تم خود پہلے ثابت کر چکے ہو، تو اس سے لازم آتا ہے کہ حضرت یوسف، خدا کے پیغمبر، خود اپنے ہاتھوں سے ملک میں "دین الملک" جاری کر رہے تھے۔ اس کے بعد اگر اپنے ذاتی معاملہ میں حضرت یوسف نے دین الملک کے بجائے شریعت ابراہیمی پر عمل کیا بھی تو اس سے فرق کیا واقع ہوا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت یوسف مامور تو دین اللہ جاری کرنے ہی پر تھے اور یہی ان کا پیغمبرانہ مشن اور ان کی حکومت کا مقصد تھا، مگر ایک ملک کا نظام عملاً ایک دن کے اندر نہیں بدل جایا کرتا۔ آج اگر کوئی ملک بالکلیہ ہمارے اختیار میں ہو اور ہم اس میں اسلامی نظام قائم کرنے کی خالص نیت ہی سے اس کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیں، تب بھی اس کے نظام تمدن، نظام معاشی، نظام سیاست اور نظام عدالت و قانون کو بالفعل بدلتے بدلتے برسوں لگ جائیں گے اور کچھ مدت تک ہم کو اپنے انتظام میں بھی سابق قوانین برقرار رکھنے پڑیں گے۔ کیا تاریخ اس بات پر شاہد نہیں ہے کہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی عرب کے نظام زندگی میں پورا اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لیے نو دس سال لگے تھے اور اس دوران میں خاتم النبیین کی اپنی حکومت میں چند سال شراب نوشی ہوتی رہی، سود لیا اور دیا جاتا رہا، جاہلیت کا قانون میراث جاری رہا، پرانے قوانین نکاح و طلاق برقرار رہے، بیوع فاسدہ کی بہت سی صورتیں عمل میں آتی رہیں، اور اسلامی قوانین دیوانی و فوجداری بھی اول روز ہی تمام و کمال نافذ نہیں ہو گئے۔ پس حضرت یوسف کی حکومت میں ابتدائی آٹھ نو سال تک سابق مصری بادشاہت کے کچھ قوانین چلتے رہے ہوں تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے اور اس سے یہ دلیل کیسے نکل آتی ہے کہ خدا کا پیغمبر مصر میں خدا کے دین کو نہیں بلکہ بادشاہ کے دین کو جاری کرنے پر مامور تھا۔ رہی یہ بات کہ جب ملک میں دین الملک جاری تھا ہی تو آخر حضرت یوسف کی اپنی ذات کے لیے اس پر عمل کرنا کیوں شایان شان نہ تھا، تو یہ سوال بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ پر غور کرنے سے با آسانی حل ہو جاتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حکومت کے ابتدائی دور میں جب تک قوانین اسلامی جاری نہ ہوئے، لوگ پرانے طریقے کے مطابق شراب پیتے رہے

(باقی صفحہ ۲۱ پر)

ہم جس کے درجے چاہتے ہیں بلند کر دیتے ہیں، اور ایک علم رکھنے والا ایسا ہے جو ہر صاحبِ علم سے بالاتر ہے۔

ان بھائیوں نے کہا "یہ چوری کرے تو کچھ تعجب کی بات بھی نہیں، اس سے پہلے اس کا بھائی (یوسف) بھی چوری کر چکا ہے"[1]۔ یوسف ان کی یہ بات سن کر پی گیا، حقیقت ان پر نہ کھولی۔ بس (زیرِ لب) اتنا کہہ کر رہ گیا کہ "بڑے ہی بُرے ہو تم لوگ (میرے منہ در منہ مجھ پر) جو الزام تم لگا رہے ہو اس کی حقیقت خدا خوب جانتا ہے"۔

انھوں نے کہا "اے سردارِ ذی اقتدار (عزیز)[2]! اس کا باپ بہت بوڑھا آدمی ہے، اس کی جگہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۰) مگر کیا حضور نے بھی پی؟ لوگ سود لیتے دیتے تھے، مگر کیا آپ نے بھی سودی لین دین کیا؟ لوگ متعہ کرتے رہے اور جمع بین الاختین کرتے رہے، مگر کیا حضور نے بھی ایسا کیا؟ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ داعیِ اسلام کا عملی مجبوریوں کی بنا پر احکامِ اسلامی کے اجرا میں تدریج سے کام لینا اور چیز ہے اور اس کا خود اس تدریج کے دور میں جاہلیت کے طریقوں پر عمل کرنا اور چیز۔ تدریج کی رخصتیں دوسروں کے لیے ہیں، داعی کا اپنا یہ کام نہیں ہے کہ خود ان طریقوں میں سے کسی پر عمل کرے جن کے مٹانے پر وہ مامور ہوا ہے۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) [1] یہ انھوں نے اپنی خفت مٹانے کے لیے کہا۔ پہلے کہہ چکے تھے کہ ہم لوگ چور نہیں ہیں۔ اب جو دیکھا کہ مال ہمارے بھائی کی خرجی سے برآمد ہو گیا ہے، تو فوراً ایک جھوٹی بات بنا کر اپنے آپ کو اس بھائی سے الگ کر لیا اور اس کے ساتھ اس کے پہلے بھائی کو لپیٹ لیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت یوسف کے پیچھے بن یمین کے ساتھ ان بھائیوں کا کیا سلوک رہا ہوگا اور کس بنا پر اس کی اور حضرت یوسف کی یہ خواہش ہوگی کہ وہ ان کے ساتھ نہ جائے۔

[2] یہاں لفظ "عزیز" حضرت یوسف کے لیے جو استعمال ہوا ہے صرف اس کی بنا پر مفسرین نے بیان کر دیا کہ حضرت یوسف اسی منصب پر مامور ہوئے تھے جس پر اس سے پہلے زلیخا کا شوہر مامور تھا۔ پھر اس پر مزید قیاسات کی عمارت کھڑی کر لی گئی کہ سابق عزیز مر گیا تھا، حضرت یوسف اس کی جگہ مقرر کیے گئے، زلیخا از سرِ نو معجزے کے ذریعے جوان کی گئی اور شاہِ مصر نے اس سے حضرت یوسف کا نکاح کر دیا۔ حد یہ ہے کہ شبِ عروسی میں حضرت یوسف اور زلیخا کے درمیان جو باتیں ہوئیں وہ تک کسی ذریعہ سے ہمارے مفسرین کو پہنچ گئیں۔ حالانکہ یہ سب باتیں سراسر وہم ہیں۔ لفظ "عزیز" کے متعلق ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ یہ مصر میں کسی خاص منصب کا نام نہ تھا بلکہ محض "صاحبِ اقتدار" کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔
(باقی صفحہ ۳۳ پر)

ہم میں سے کسی کو رکھ لیجیے، ہم آپ کو بڑا ہی نیک نفس انسان پاتے ہیں۔" یوسف نے کہا "پناہ بخدا! دوسرے کسی شخص کو ہم کیسے پکڑ سکتے ہیں، جس کے پاس ہم نے اپنا مال پایا ہے [۵۵] اس کو چھوڑ کر دوسرے کو پکڑیں گے تو ہم ظالم ہوں گے۔" ع۹

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳) غالباً مصر میں بڑے لوگوں کے لیے اس طرح کا کوئی لفظ اصطلاحاً رائج تھا جیسے ہندوستان میں لفظ "سرکار" بولا جاتا ہے۔ اسی کا ترجمہ قرآن میں عزیز کیا گیا ہے۔ رہا زلیخا سے حضرت یوسف کا نکاح تو اس افسانے کی بنیاد صرف یہ ہے کہ بائیبل اور تلمود میں فوطیفرع کی بیٹی آسناتھ سے ان کے نکاح کی روایت بیان کی گئی ہے، اور زلیخا کے شوہر کا نام فوطیفار تھا۔ یہ چیزیں اسرائیلی روایات سے نقل در نقل ہوتی ہوئی مفسرین تک پہنچیں اور جیسا کہ زبانی افواہوں کا قاعدہ ہے، فوطیفرع با آسانی فوطیفار بن گیا، بیٹی کی جگہ بیوی کو مل گئی اور بیوی لامحالہ زلیخا ہی تھی، لہٰذا اس سے حضرت یوسف کا نکاح کرنے کے لیے فوطیفار کو مار دیا گیا، اور اس طرح "یوسف زلیخا" کی تصنیف مکمل ہو گئی۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) ۵۵ احتیاط ملاحظہ ہو کہ "چور" نہیں کہتے بلکہ صرف یہ کہتے ہیں کہ "جس کے پاس ہم نے اپنا مال پایا ہے"۔ اسی کو اصطلاح شرع میں "توریہ" کہتے ہیں، یعنی "حقیقت پر پردہ ڈالنا" یا "امر واقعہ کو چھپانا"۔ جب کسی مظلوم کو ظالم سے بچانے یا کسی بڑے مظلمہ کو دفع کرنے کی کوئی صورت اس کے سوا نہ ہو کہ کچھ خلاف واقعہ بات کہی جائے یا کوئی خلاف حقیقت حیلہ کیا جائے، تو ایسی صورت میں ایک پرہیزگار آدمی صریح جھوٹ بولنے سے احتراز کرتے ہوئے ایسی بات کہنے یا ایسی تدبیر کرنے کی کوشش کرے گا جس سے حقیقت چھپا کر بدی کو دفع کر دیا جائے۔ اور یہ شرع و اخلاق میں جائز ہے، بشرطیکہ محض کام نکالنے کے لیے ایسا نہ کیا جائے بلکہ کسی برائی کو دور کرنا ہو۔ اب دیکھیے کہ اس سارے معاملہ میں حضرت یوسف نے کس طرح جائز توریہ کی شرائط پوری کی ہیں۔ بھائی کی رضامندی سے اس کے سامان میں پیالہ رکھ دیا مگر ملازموں سے یہ نہیں کہا کہ ان پر چوری کا الزام لگاؤ۔ پھر جب سرکاری ملازم چوری کے الزام میں ان لوگوں کو پکڑ لائے تو خاموشی کے ساتھ اٹھ کر تلاشی لے لی۔ پھر اب جو ان بھائیوں نے کہا کہ بن یمین کی جگہ ہم میں سے کسی کو رکھ لیجیے تو اس کے جواب میں بھی بس انہی کی بات ان پر الٹ دی کہ تمہارا اپنا فتویٰ یہ تھا کہ جس کے سامان میں سے تمہارا مال نکلے وہی پکڑ لیا جائے، سو اب تمہارے سامنے بن یمین کے سامان میں سے ہمارا مال نکلا ہے اور اسی کو ہم پکڑے لیتے ہیں، دوسرے کو اس کی جگہ کیسے پکڑ سکتے ہیں۔ اس قسم کے توریہ کی مثالیں خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات میں بھی ملتی ہیں، اور کسی دلیل سے بھی اس کو اخلاقاً معیوب نہیں کہا جا سکتا۔

جب وہ یوسف سے مایوس ہو گئے تو ایک گوشے میں جا کر آپس میں مشورہ کرنے لگے۔ ان میں جو سب سے بڑا تھا وہ بولا "تم جانتے ہو کہ تمھارے والد تم سے خدا کے نام پر عہد و پیمان لے چکے ہیں، اور اس سے پہلے یوسف کے معاملہ میں جو زیادتی تم کر چکے ہو وہ بھی تم کو معلوم ہے۔ اب میں تو یہاں سے ہرگز نہ جاؤں گا جب تک کہ میرے والد مجھے اجازت نہ دیں، یا پھر اللہ ہی میرے حق میں کوئی فیصلہ فرما دے کہ وہ سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔ تم جا کر اپنے والد سے کہو کہ ابا جان! آپ کے صاحبزادے نے چوری کی ہے، ہم نے اسے چوری کرتے ہوئے نہیں دیکھا، جو کچھ ہمیں معلوم ہوا ہے بس وہی ہم بیان کر رہے ہیں، اور غیب کی نگہبانی تو ہم نہ کر سکتے تھے۔ آپ اُس بستی کے لوگوں سے پوچھ لیجیے جہاں ہم تھے، اس قافلے سے دریافت کر لیجیے جس کے ساتھ ہم آئے ہیں، ہم اپنے بیان میں بالکل سچے ہیں۔"

باپ نے یہ داستان سن کر کہا "دراصل تمھارے نفس نے تمھارے لیے ایک اور بڑی بات کو سہل بنا دیا۔[1] اچھا اس پر بھی صبر کروں گا اور بخوبی کروں گا۔ کیا بعید ہے کہ اللہ ان سب کو مجھ سے لا ملائے، وہ سب کچھ جانتا ہے اور اس کے سب کام حکمت پر مبنی ہیں۔" پھر وہ ان کی طرف سے منہ پھیر کر بیٹھ گیا اور کہنے لگا کہ "ہائے یوسف!" ــــ وہ دل ہی دل میں غم سے گھٹا جا رہا تھا اور اس کی آنکھیں سفید پڑ گئی تھیں ــــ بیٹوں نے کہا "خدارا! آپ تو بس یوسف ہی کو یاد کیے جاتے ہیں۔ نوبت یہ آ گئی ہے کہ اس کے غم میں اپنے آپ کو گھلا دیں گے یا اپنی جان ہلاک کر ڈالیں گے۔" اس نے کہا "میں اپنی پریشانی اور اپنے غم کی فریاد اللہ کے سوا کسی سے نہیں کرتا، اور اللہ سے جیسا میں واقف ہوں تم نہیں ہو۔ میرے بچو! جا کر یوسف اور اس کے بھائی کی کچھ ٹوہ لگاؤ، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، اس کی رحمت سے تو بس کافر ہی مایوس ہوا کرتے ہیں۔"

جب یہ لوگ مصر جا کر یوسف کی پیشی میں داخل ہوئے تو انھوں نے عرض کیا کہ "اے سردار با اقتدار!

---

[1] یعنی تمھارے نزدیک یہ باور کر لینا بہت آسان ہے کہ میرا بیٹا، جس کے حسن سیرت سے میں خوب واقف ہوں، محض ایک پیالے کی چوری کا مرتکب ہو سکتا ہے۔ پہلے تمھارے لیے ایک بھائی کو جان بوجھ کر گم کر دینا اور اس کے قمیص پر جھوٹا خون لگا کر لے آنا بہت آسان کام ہو گیا تھا، اب ایک دوسرے بھائی کو واقعی چور مان لینا اور مجھے آکر اس کی خبر دینا بھی ویسا ہی آسان ہو گیا۔

ہم اور ہمارے اہل و عیال سخت مصیبت میں مبتلا ہیں، اور ہم کچھ حقیر سی پونجی لے کر آئے ہیں آپ ہمیں بھرپور غلہ عنایت فرمائیں اور ہم کو خیرات دیں۔[1] اللہ خیرات کرنے والوں کو جزا دیتا ہے۔" (یہ سن کر یوسف سے نہ رہا گیا) اس نے کہا "تمھیں کچھ یہ بھی معلوم ہے کہ تم نے یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا کیا تھا جبکہ تم نادان تھے؟" وہ چونک کر بولے "ہائیں! کیا تم یوسف ہو؟" اس نے کہا "ہاں، میں یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی ہے۔ اللہ نے ہم پر احسان فرمایا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر کوئی تقویٰ اور صبر سے کام لے تو اللہ کے ہاں ایسے نیک لوگوں کا اجر مارا نہیں جاتا۔" انھوں نے کہا "بخدا کہ تم کو اللہ نے ہم پر فضیلت بخشی اور واقعی ہم خطاکار تھے۔" اس نے جواب دیا "آج تم پر کوئی گرفت نہیں، اللہ تمھیں معاف کرے، وہ سب سے بڑھ کر رحم فرمانے والا ہے۔ جاؤ، میرا یہ قمیص لے جاؤ اور میرے والد کے منہ پر ڈال دو، ان کی بینائی پلٹ آئے گی، اور اپنے سب اہل و عیال کو میرے پاس لے آؤ۔" ع

[1] یعنی ہماری اس گذارش پر جو کچھ آپ دیں گے وہ گویا آپ کا صدقہ ہوگا۔ اس غلے کی قیمت میں جو پونجی ہم پیش کر رہے ہیں وہ تو بے شک اس لائق نہیں ہے کہ ہم کو اس قدر غلہ دیا جائے جو ہماری ضرورت کو کافی ہو۔

گذارش

جو حضرات جماعت اسلامی کے بیت المال یا مکتبہ جماعت اسلامی یا دفتر ترجمان القرآن کو اپنی رقمیں بینک کے چک کی صورت میں بھیجتے ہیں ان سے التماس ہے کہ براہ کرم منی آرڈر یا بیمہ کی صورت میں بھیجا کریں۔ کیونکہ ہمارے کسی دفتر کا حساب بینک میں نہیں ہے اور چک بھنانے میں ہم کو بہت زحمت اٹھانی پڑتی ہے۔

"ناظم بیت المال"

مقالات

اساسِ دین کی تعمیر

(۳)

از جناب مولوی صدرالدین صاحب اصلاحی

ماحول کا جائزہ اگر آپ اس اصول کو سامنے رکھ کر "خدا کے نزدیک وہی ایمان بالآخرت قابل پذیرائی ہے جو اپنی پشت پر حسن عمل اور پابندی شرع کی مضبوط شہادتیں رکھتا ہو"، اپنے ماحول کا جائزہ لیں گے تو آپ کو ایک تلخ اور دل شکن صورت حال نظر آئے گی اور آپ کو یوں محسوس ہوگا کہ قرآن کی جن آیات میں یہودیوں کی بدعملیوں اور آخرت فراموشیوں کی روداد مذکور ہے وہ کسی نہ کسی حد تک مسلمانوں کے حال پر بھی چسپاں ہو رہی ہیں۔ ہم یہ تو نہیں کہتے کہ امت محمدیہ بحیثیت مجموعی آخرت فراموشی کے اسی مقام پر پہنچ گئی ہے، جہاں قوم یہود پہنچی تھی مگر یہ کہنے سے ہم اپنے کو کیونکر باز رکھیں کہ اس کی اکثریت اپنے عمل میں کم و بیش انہی صفات کا اظہار کر رہی ہے جن پر بنی اسرائیل گرفتار غضب الٰہی ہوئے تھے۔ انفرادی طرز زندگی میں، اجتماعی معاملات میں، معاشرتی تعلقات میں، معاشی کاروبار میں، گھر میں، بازار میں، حتیٰ کہ مدرسہ اور خانقاہ تک میں جو کچھ ہو رہا ہے اور برابر ہوتا رہتا ہے اس کی تہ میں آپ فکر فردا اور اندیشۂ آخرت کا اگر کھوج لگائیں گے تو معلوم ہوگا کہ اب مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد نے اس فکر اور اس اندیشے سے اپنے دلوں کو گویا خالی ہی کر لیا ہے۔ یہ جو کام بھی کرنے اٹھتے ہیں اس کے دنیوی فوائد اور مصالح سوچنے میں تو اپنے اوپر خواب و خور حرام کر لیتے ہیں مگر شاید فکر آخرت کی ایک معمولی خلش بھی ان کے دماغ میں پیدا نہیں ہونے پاتی۔ اور جن لوگوں نے ابھی اس فکر کو اپنے دماغوں سے بالکل خارج نہیں کیا ہے ان میں سے بھی اکثر اس بھروسے پر غلط کام کرتے ہیں کہ "سَیُغْفَرُ لَنَا" اور "لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّا اَیَّامًا مَّعْدُوْدَۃً"۔ ان کا خیال یہ ہے کہ

ہم خواہ کچھ کریں، بہر حال جب ہم مسلمان گھر میں پیدا ہو چکے ہیں تو اب اللہ میاں مجبور ہیں کہ ہمیں بخش دیں، چاہے بلا حساب بخشیں یا چند دنوں کی معمولی گوشمالی کے بعد۔ ان دونوں گروہوں کو اگر الگ کر دیجیے تو صرف ایک قلیل ترین حصہ ایسے لوگوں کا بچتا ہے جو اس فکر آخرت کو اپنے ذہنوں میں وہی جگہ دیتے ہیں جو دینا چاہیے اور جس کو قرآن کا مطلوبہ ایمان بالآخرت کہا جا سکتا ہے۔ مگر یہ حصہ اتنا قلیل التعداد ہے اور مسلمانوں کی پھیلی ہوئی آبادی میں اتنا منتشر ہے، اور مزید برآں اجتماعی اصلاح کے لیے منظم جہاد کرنے سے بھی اس قدر غافل یا کوتاہ ہے کہ اس شرذمۂ قلیلہ کی موجودگی کا کوئی اثر مسلمانوں کی قومی زندگی پر یا ان کی قومی پالیسی پر مترتب نہیں ہو رہا ہے۔

ایمان بالآخرت کی فکری تطہیر ان حالات میں، اور دنیوی فتنوں سے بھرے ہوئے اور خوفِ آخرت سے نا آشنا ماحول میں جن بندگانِ خدا کو اپنی زندگی کا مقصد یاد آ رہا ہو اور جن کو دینِ حق سے وابستگی، اس کی اطاعت اور اس کی اقامت کے احساسِ فرض نے سعی و عمل کی آزمائش گاہ میں لا کھڑا کیا ہو انھیں اپنے اردگرد چھائے ہوئے نفسیات اور ان کے متعدد اثرات سے پوری طرح چوکنا رہنا چاہیے۔ ان کو یاد رکھنا چاہیے کہ ماحول کی طاقت ایک زبردست طاقت ہوتی ہے، جس کے اثرات سے بچنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا دریا میں رہتے ہوئے تر دامنی سے بچنا۔ یہ ماحول اپنے جراثیم نہ صرف شعوری طور پر ہی بلکہ غیر شعوری طور پر بھی ذہنوں میں داخل کرتا رہتا ہے۔ اس لیے سب سے پہلے تو انھیں اپنے قلب و دماغ کے مکمل جائزہ کی طرف توجہ کرنی چاہیے، اور جس طرح کسی حکومت کی پولیس دشمن کے جاسوس کی جامہ تلاشی لیتی اور اس کے ایک ایک تار کو ادھیڑ کر دیکھتی ہے کہ کہیں کسی گوشے میں حکومت کے خلاف کوئی راز تو نہیں موجود ہے، بعینہٖ اسی طرح پوری دیدہ ریزی اور انتہائی ہوشیاری کے ساتھ انھیں اپنے قلب و دماغ کے عمیق ترین گوشوں تک پہنچنا چاہیے اور پہنچ کر دیکھنا چاہیے کہ اس مملکتِ ایمان میں کہیں نفس اور شیطان کے جاسوس چھپے ہوئے اپنی کارستانیاں تو نہیں کر رہے ہیں؟ یعنی معاملاتِ زندگی کے اندر اپنے عمل و اقدام کا رویہ معین کرنے میں اور خیر و شر کے دوراہے پر کسی ایک راہ کا انتخاب کرنے میں ان کا دل فکر و خوفِ آخرت سے خالی تو نہیں رہتا؟ "سَيُغْفَرُ لَنَا" اور "لَن تَمَسَّنَا النَّارُ" کی جھوٹی امیدیں کہیں انھیں دنیا پرستی پر تو نہیں

اکساتیں؟ اور پھر یہ کہ وہ جو اقامت دین کا نام لے رہے ہیں اس کی تہ میں کہیں مسلم قومیت کا جذبہ تو نہیں کام کر رہا ہے؟ کوئی شوق انجمن سازی، کوئی آرزوئے ناموری، کوئی ہوس روشناسی، کوئی فریب اقتدار طلبی اس نعرہ کا محرک تو نہیں؟ اسی طرح وہ کہیں اس مقدس فرض عین کو محض اس بنیاد پر تو بجا لانے نہیں چلے ہیں کہ موجودہ عالمگیر معاشی کشاکش اور عمرانی اضطراب اور سیاسی اختلال کے ہنگاموں میں اسلام کا نظام سیاست ومعیشت اُن کو ان ساری گتھیوں کا ایک موزوں حل نظر آرہا ہے؟ اس لیے کہ اس طرح کے محرکات کا رشتہ بھی کچھ گہرائی میں پہنچ کر اسی اصل ومرکز سے جاملتا ہے جس کو دنیا پرستی کہا جاتا ہے اور ہم یہ پہلے بتا چکے ہیں کہ دنیا پرستی یعنی دنیوی اغراض ومفاد کی بندگی اور ایمان بالآخرت میں واضح تضاد ہے اور یہ معلوم ہے کہ اقامت حق کی راہ دشوار پر اُس وقت تک ایک قدم بھی نہیں بڑھا جا سکتا جب تک کہ دل دنیا پرستی کے ان مختلف اشکال ومظاہر سے پاک اور آخرت کی حقیقی جوابدہی کے اندیشوں سے معمور نہ ہو ورنہ ان تمام اغراض سفلی کو یا ان میں سے کسی ایک غرض کو بھی دل میں چھپا کر اقامت دین کی مہم سر کرنے کا خیال باندھنا نہ صرف ضیاع وقت اور موجب تضحیک ہے بلکہ خدا کے دین کو تماشا اور اس کو اپنا آلۂ کار بنانا بھی ہے، جو خدا کو اس سے کہیں زیادہ مبغوض ہے جتنا اس فرض کا علانیہ ترک مبغوض ہے۔ پس ضرورت ہے کہ اس فرض کو ادا کرنے کی مہم شروع کرنے سے پہلے اپنے قلب ونظر کو اس نوع کے جذبات ومحرکات سے پاک کر لیا جائے اور آخرت کی بازپرس کے سوا کوئی محرک باقی نہ رہنے دیا جائے۔ اس ضرورت کی وجہ صرف یہی نہیں ہے کہ اس کے بغیر اللہ تعالیٰ کے حضور ہماری سعی وجہد مقبول نہیں ہوگی بلکہ یہ بھی ہے کہ اس کے بغیر ہم کو وہ طاقت، وہ عزیمت وہ صبر، وہ اطمینان، وہ استقلال، وہ بے خوفی، حصول مقصد کی وہ تڑپ، سعی واقدام میں وہ سرفروشی، مآل کار سے وہ بے پروائی میسر نہیں ہو سکتی جو اس راہ کا تنہا توشہ اور اس کارزار کا واحد حربہ ہے۔ ایمان باللہ کے ساتھ ساتھ ایمان بالآخرت ہی وہ تنہا سہارا ہے جو سخت سے سخت حالات میں انسان کی ڈھارس بندھا سکتا اور اس کے قدموں کو اپنی جگہ پر جمائے رکھ سکتا ہے۔ اگر اندر یہ یقین زندہ نہیں اور اگر آخرت کی بازپرس کا دل ہلا دینے والا تصور آنکھوں کے سامنے ایک مجسم حقیقت بن کر موجود نہیں تو اس بات کی ہرگز کوئی توقع نہیں کی جا سکتی کہ انسان اس منزل ''ہفت خوان'' کو چند قدم بھی طے کر سکے گا۔ اور یقین جانیے

اگر آج نہیں تو کل وہ یہی کہتا ہوا اپنے پاؤں پھر جائے گا کہ "حق تو یہی ہے مگر موجودہ حالات میں اس کی کامیابی ناممکن ہے"۔ چنانچہ یہ جو آج آپ ہر طرف سے ناممکن ناممکن کا شور سن رہے ہیں اس کی علت اس کے سوا کچھ نہیں کہ قیامت کی جوابدہی کے احساس پر مردنی چھا رہی ہے اور لوگوں کو اپنے رب کے حضور کھڑے ہونے کی اتنی فکر نہیں جتنی قوم اور ملک اور دنیا کے سامنے کھڑے ہونے کی ہے۔

جہاں تک ہمارا اندازہ کام کرتا ہے بعض لوگ جنھوں نے شعوری طور پر تجدید ایمان کی ہے، دنیا پرستی کے دوسرے فتنوں اور اس کے اشکال و مظاہر سے تو بحمداللہ دامن کشاں ہو چکے ہیں، مگر ایک فتنہ ایسا ضرور ہے جس کے پھندوں میں ان کے پاؤں شاید ابھی تک الجھے ہوئے ہیں، اور وہ یہ کہ ان کے اقامت دین کو مقصد زندگی بنانے کی اصلی محرک محض اسلام کے سیاسی اور معاشی نظام کی جاذبیت ہے، اور وہ بھی غالباً اسلام کے ساتھ ایک موروثی عصبیت کی بنا پر۔ آخرت کی بازپرس اگر اس اقدام کی محرک ہے بھی تو محض ثانوی حیثیت سے ہے۔ — خدا کرے ہمارا یہ اندازہ غلط اور یکقلم خلاف واقعہ ہو، پر قرائن اس کا شبہہ ضرور دلاتے ہیں۔ دراصل اس وقت نظم مملکت اور معاش کے مسائل نے اتنی ہمہ گیر اہمیت اختیار کر لی ہے کہ آج کا ہر مفکر کسی نظام کا حسن و قبح معلوم کرنے کے لیے صرف یہ دیکھتا ہے کہ اس نے معاشی مسئلہ کا کیا حل پیش کیا ہے؟ یہ انداز فکر اتنا مقبول عام اور یہ معیار انتخاب اتنا آفاق گیر ہو چکا ہے کہ اب کہیں سے اس کے خلاف کسی آواز کا اٹھنا قریباً ناممکن ہے۔ اس عالم میں اس معروف عام اور مختار کل فکری شاہراہ سے ہٹ کر انسانیت اور انسانی زندگی کے مسائل پر سوچنا دریا کے مخالف رخ پر تیرنے سے کم دشوار نہیں اور جب صورت حالات یہ ہے تو اس امکان کو کیونکر ناقابل اعتبار سمجھا جا سکتا ہے کہ بعض خدا کے نام لیوا بھی نادانستہ اس ڈگر پر جا پڑے ہوں۔ پس جہاں ہمیں اپنے محرک عمل، یعنی اپنے ایمان بالآخرت کو اغراض و مصالح دنیوی کی تمام غلاظتوں سے پاک کرنے کی بالعموم ضرورت ہے وہاں اس لطیف باد ناپاک سے قلب و دماغ کی تطہیر خاص توجہ کی مستحق ہے۔ یہ کام محض اس لیے کرنا چاہیے کہ ہم کو ایک دن اس کی جوابدہی کرنی ہے نہ اس لیے کہ اس کے ہو جانے سے دنیا کا معاشی توازن درست ہو جائے گا، یا اس کی طبقاتی نزاع ختم ہو جائے گی، یا اس کی سیاست کا تشنج دور ہو جائے گا۔ یہ باتیں ان سے تو کی جا سکتی ہیں جو اسلام کے منکر ہیں تاکہ ان پر

اس کی فطری صداقتیں واضح ہو سکیں اور وہ ایک شاخ کی دلآویزی کو دیکھ کر اس کی اصل کی، اور بحیثیت مجموعی اس پورے شجرۂ طیبہ کی برکتوں کا اندازہ لگا سکیں۔ مگر ان کو، جو شرح صدر کی نعمتوں سے نوازے جاچکے ہیں اور جو اللہ اور یوم آخرت پر یقین رکھتے ہیں، اس پستی اور پست نگاہی سے بہت بلند ہونا چاہیے۔ ان کو تو تن من دھن سے اللہ تعالیٰ کے احکام کی پیروی اور اس کے دین کی اقامت میں منہمک رہنا چاہیے اور اگر کوئی اس جانفشانی کی وجہ سننی چاہے تو ان کی زبان سے نہیں بلکہ ان کے ایک ایک رونگٹے سے بے ساختہ انّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا کی چیخ نکل جانی چاہیے۔

عملی تطہیر ایمان بالآخرت کی اس فکری تطہیر کے بعد دوسرا قدم اس کے عملی جائزہ کی طرف اٹھانا چاہیے جس کا مفصل ذکر ایمان باللہ کے سلسلے میں ہم کر چکے ہیں، یعنی ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ ہمارے اس ایمان میں کتنی طاقت، کیسی کچھ عملی تاثیر، کتنا رسوخ اور کتنی زندگی ہے؟ وہ روزمرہ کے معاملات میں ہم کو خدا پرستانہ طرز عمل اختیار کرنے پر کتنا ابھارتا ہے؟ وہ ہماری بندگی رب میں شان حنیفیت پیدا کرنے کا کس قدر بل بوتا رکھتا ہے؟ اور ہم اس کے تقاضوں کو کس حد تک پورا کر رہے ہیں؟ اگر اس عملی جائزہ سے آپ کو یہ حقیقت محسوس ہو کہ کم تر یا بیشتر، ہمارے فکر و عمل کی باگ ڈور خوف آخرت کے ہاتھوں سے چھوٹ جایا کرتی ہے — اور کون ہے جو اس سے انکار کی جرأت کر سکتا ہے — تو خود ساختہ تاویلوں اور حیلہ جوئیوں کی روش عام سے بچ کر ایک سیدھے سادے مسلمان کی طرح اپنی کوتاہیوں اور غفلتوں کا دل میں اعتراف کر لینا ہے اور یقین کر لینا چاہیے کہ جس خوفِ قیامت کے ذکر و بیان سے ہماری زبان کو اتنا تعلق ہے، اس کے تذکرا اور تیقن سے ہمارے قلب کو اتنا تعلق نہیں ہے، اور ہمارے اندر جو ایمان بالآخرت ہے اس کی روح فی الواقع ابھی تک غفلت اور نیم مردگی کی حالت میں مبتلا ہے۔ اس احساس و اعتراف کے بعد دوسرا فرض یہ ہے کہ اس صورت حال کا علاج کیا جائے اور اپنی ساری طاقتوں کو مجتمع کر کے پورے زور کے ساتھ اس دیو غفلت کے آہنی پنجوں سے اس مقدس روح کو آزاد کرایا جائے۔ یہ کیسے ہو گا؟ اس کے لیے آپ کو کم و بیش وہی تدبیریں کرنی پڑیں گی جن کا ذکر ہم ایمان باللہ کے سلسلے میں کر چکے ہیں۔

تحصیل نور یقین سب سے پہلے تو اس ایمان کو محض باپ دادا کی ایک موروثی امانت کے طور پر گلے لگائے

رکھنے کا طریقہ ترک کر دینا چاہیے۔ کسی خیال یا نظریہ کو صرف اس بنا پر ماننا، کہ ہمارے بزرگ اور ہمارے اسلاف و اکابر اس کو تسلیم کرتے آئے ہیں۔ اس نظریہ کے پیرووں اور علم برداروں کی صف میں شمولیت کا دعویٰ ثابت کرنے کے لیے تو کافی ہے مگر کسی سینہ میں وہ آگ لگانے کے لیے قطعاً ناکافی بلکہ ناکارہ ہے جس کا وہ نظریہ مطالبہ کرتا ہے۔ کسی فکر کی نری تقلید میدان جد و جہد کے غازی اور جانباز سپاہی ہرگز نہیں پیدا کر سکتی۔ وہ اگر کچھ کر سکتی ہے تو زیادہ سے زیادہ یہ کہ اس معرکہ کے لیے خیمہ بردار قلی مہیا کر دے۔ سینے میں آگ صرف وہ نظریہ بھڑکا سکتا ہے جو اتباع آبا کے پردوں سے نکل کر انسان کی لوح قلب و دماغ پر براہ راست اپنی صداقت کی آتشیں شعاعیں ڈال رہا ہو، اور میدان سعی و جہد کے جانفروش صرف وہ فکر مہیا کر سکتی ہے جو کارخانۂ تقلید سے مستعار نہ لی گئی ہو بلکہ انسان کے اپنے شعور و تعقل میں گہری جڑیں رکھتی ہو۔ انسان کے بس میں یہ نہیں ہے کہ جس چیز کو اس نے خود محسوس نہ کیا ہو اس کو اُس چیز کے برابر کر لے جسے وہ خود محسوس کرتا ہو۔ محسوس کرنے والے کا بیان خواہ کتنا ہی موثر ہو اور سننے والا کتنا ہی متاثر ہونے والا کیوں نہ ہو بہرحال دوسرے کی روایت سے آدمی کبھی اتنا پائیدار اثر نہیں لے سکتا جتنا خود محسوس کرنے کی صورت میں لیا کرتا ہے۔ بڑے بڑے قادر الکلام شاعر کی زبان سے بھی سوز عشق اور درد فراق کے مضامین سن کر آدمی کے دل میں وہ تڑپ پیدا نہیں ہوتی جو خود عشق کی آگ میں جلنے اور ہجر کے انگاروں پر لوٹنے سے پیدا ہوا کرتی ہے۔ پس جب تک آدمی کا ایمان محض اس بنیاد پر قائم رہے گا کہ اس کے باپ دادا ان چیزوں کو مانتے تھے، اس میں نہ تو صحیح کیفیات ایمانی پائی جا سکیں گی اور نہ وہ ایمان کے تقاضے ہی پورے کر سکے گا۔ اس غرض کے لیے ناگزیر ہے کہ ایمان محض تقلیدی نہ ہو بلکہ ذاتی یقین و اذعان پر مبنی ہو۔

یہ نور یقین حاصل کیسے ہو؟ اس کے حصول کا ذریعہ صرف ایک ہے اور اس کے سوا کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہے، اور وہ ہے قرآن کا غائر مطالعہ اور پھر اس کی رہنمائی میں آفاق و انفس کی آیات پر تفکر۔ رہا فلسفۂ یونان و عجم تو وہ اس ایمان کے حصول میں تو کچھ بھی مدد نہیں دے سکتا، البتہ اس سے دور پھینک دینے میں بہت کچھ کارگر ہو سکتا ہے۔ درحقیقت یہ بھی ہماری تاریخ دینی کا ایک سخت المناک باب ہے کہ لوگوں نے عقائد و نظریات تو قرآن سے لے لیے مگر ان کی صداقتوں پر دلائل مہیا کرنے کے لیے وہ

یونانی تفلسف کے اس بیابان میں جا دوڑے جہاں شک و ریب اور تذبذب و وساوس کی خار دار جھاڑیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ نہ جانے انھیں کس چیز نے اتنی موٹی سی بات سمجھنے سے روک دیا کہ جب قرآن نے بنی نوع انسان کو ان عقائد و نظریات کی تعلیم دی ہے وہ خود ہی ان کے دلائل بھی پیش کرتا ہے اور اس کے دلائل ایسے ہیں جو عین فطرت کی صدا ہیں اور ان عقائد کے باب میں دماغ کو تسکین، قلب کو طمانیت اور روح کو نور یقین بخش سکتے ہیں۔

ضرورت ہے کہ اب اس غلطی کا اعادہ نہ کیا جائے اور قرآنی عقائد کی صحت کا یقین حاصل کرنے کے لیے فلسفۂ مغرب کی طرف رجوع کرنے کے بجائے ان فطری اور دلنشین دلائل سے مدد لی جائے جو خود قرآن نے پیش کیے ہیں۔ مگر مشکل یہ ہے کہ یہاں ایک دوسری غلط فہمی سنگ راہ بنی ہوئی ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ دلائل تو ان کے منانے کے ہیں جو قیامت کے منکر ہیں، چنانچہ ان کے بیان کے وقت قرآن انھیں کو مخاطب بھی کرتا ہے۔ ہم کو جو پہلے ہی سے قیامت کا اقرار کیے بیٹھے ہیں، ان دلائل سے کیا لینا ہے؟[1] افسوس ہے کہ یقین و سعادت کے کیسے ہی خزانے ہیں جنھیں جہل کے اس "نورانی حجاب" نے ہماری نگاہوں سے اوجھل کر رکھا ہے۔ اور مزید افسوس اس چیز کا ہے کہ یہ بات اسی قرآن کو پڑھتے ہوئے فرمائی جاتی ہے جو علانیہ کہہ چکا ہے کہ

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ	بے شک آسمانوں اور زمین کی ساخت میں، اور شب و
وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ	روز کے بعد دیگرے آمد و رفت میں عقل والوں کے لیے
لِأُولِي الْأَلْبَابِ	بڑی نشانیاں ہیں۔

معلوم ہے کہ "عقل والے" کون لوگ ہیں جن کے لیے (یعنی جن کی عبرت پذیری اور یقین افزائی کے لیے

---

[1] یہی تصور ہے جس نے قرآن کی تعلیم کو ہمارے دینی دارالعلوموں میں وہ حیثیت دلوائی ہے جو صدہا برس کی مردہ منطق و فلسفہ کی تعلیم سے بھی کہیں فروتر ہے۔ وہ فلسفہ جو ابھی تک زمین کو کسی قطب کی طرح ساکن ٹھہرائے ہوئے ہے اور جو ابھی تک یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہے کہ کوئی شے بیک وقت دو نوع کی حرکتیں بھی کر سکتی ہے! تعلیم قرآن کے بارے میں کھلم کھلا یہ بات کہی جاتی ہے کہ اس پر تو محض تبرک کے لیے نظر ڈال دی جاتی ہے ورنہ ائمہ نے اس کے تمام احکام نکال کر فقہ کی کتابوں میں مدون کر دیے ہیں۔ گویا فقہی احکام کے ماسوا جو کچھ ہے وہ ہمارے لیے نہیں ہے بلکہ تیرہ صدیاں پیشتر بسنے والے کفار عرب اور منافقین مدینہ اور اہل کتاب ہی کے سننے سنانے کے لیے تھا۔

کائنات کی خلقت اور اس کے نظم ونسق میں بے شمار نشانیاں بتلائی گئی ہیں؟ یہ کوئی فلاسفہ یا علمائے طبعیات وفلکیات کا گروہ نہیں ہے، بلکہ یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لاچکے ہیں اور باعتبار اعمال صالحہ خدا پرستی کی معراج کمال کو پہنچے ہوئے ہیں۔ چنانچہ قرآن اپنے اس لفظ کی تفسیر خود ہی آگے چل کر اس طرح کرتا ہے:

اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰهَ قِیَامًا	(یعقل والے وہ ہیں) جو کھڑے، بیٹھے، لیٹے (ہر حال میں) اللہ
وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ	کو یاد کرتے رہتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی ساخت میں
خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	غور و فکر کیا کرتے ہیں۔

یہ الفاظ جہاں اس حقیقت کو اجاگر کرتے ہیں کہ کائنات کے اس وسیع و عریض کارخانہ میں امرِ حق کی طرف رہنمائی کرنے والی نشانیاں صرف ان کے لیے ہیں جو خدا کے سچے پرستار ہیں، وہاں اس معاملے کے دوسرے پہلو کو بھی بالکل روشن کیے دیتے ہیں کہ زمین و آسمان کی آفرینش میں غور و تدبر کرتے رہنا ان بندگانِ حق کا ایک مستقل وصف ہے۔ یہ نہ گمان کرو کہ کہیں اتفاق سے اگر ان کی نگاہ آفاق وانفس کے ان حقائق کی طرف مڑ گئی تو وہ ان میں کوئی نشانی پالیتے ہیں۔ نہیں، جس طرح ذکرِ الٰہی ان کا وظیفۂ حیات ہے اسی طرح "تفکر فی الخلق" بھی ان کا ایک نشانِ امتیاز ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ اس تفکر سے وہ حاصل کیا کرتے ہیں اور اس کارخانۂ عالم کی ساخت وپرداخت میں انھیں کس چیز کی نشانیاں نظر آتی ہیں؟ تو اس کا جواب بھی قرآن ہی کی زبان سے سنیے، جو فوراً ہی بعد فرماتا ہے:

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ	(آسمان و زمین کی خلقت میں غور کر کے یہ لوگ بے ساختہ بول اٹھتے ہیں) پروردگار! تو نے یہ کارخانہ عبث نہیں پیدا کیا ہے
فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ	
(آل عمران — ۲۰)	پس ہمیں آگ کی سزا سے بچا۔

اسی طرح سورہ مرسلات کی ابتدائی آیات کو پڑھیے، جہاں ہواؤں کے مختلف حالات اور ان کے گوناگوں اثرات کو یومِ جزا کی آمد پر بطور قسم (شہادت) پیش کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ:

..... فَالْمُلْقِيٰتِ ذِكْرًا۔ عُذْرًا	پھر (جو اپنی تصریف کے ذریعہ) لوگوں کو یاددہانی کرتی ہیں

اَوْ نُذْرًا ۔ اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ ۔ تاکہ (غافلوں کے خلاف) معذرت (اور حجت) ہو اور (خدا ترسوں کے لیے) ڈراوے کا کام دے۔ (ہواؤں کے یہ مختلف حالات اور اثرات شاہد ہیں کہ) جس چیز کی تمھیں دھمکی دی جا رہی ہے وہ بالیقین وقوع میں آکر رہے گی۔

سورہ ہود کے اندر نافرمانیِ رب کی پاداش میں ہلاک ہو جانے والی چند بستیوں اور قوموں کی سرگزشت سنانے کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ:

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الْاٰخِرَۃِ ۔ یقیناً اس (داستانِ اقوامِ بائدہ) کے اندر اس شخص کے لیے بڑی زبردست نشانی ہے جو آخرت کی سزا کا خوف کرے۔

یہ اور اس قسم کے اور بہت سے قرآنی بیانات بالکل غیر مشتبہ طور پر اس حقیقت کی تصریح کرتے ہیں کہ قرآن کے بیان کردہ دلائلِ آفاق و انفس جس طرح منکرینِ اسلام سے خطاب کرتے ہیں بعینہٖ اسی طرح ان کا روئے سخن خود پیروانِ قرآن کی طرف بھی ہے، بلکہ جہاں تک عملاً ان سے فائدہ اٹھانے کا تعلق ہے، وہ تو صرف انھی کے لیے ہے۔ اس لیے کہ گو سورج سب کے لیے نکلتا ہے، پر حقیقت میں اس کا نکلنا صرف انھی کے لیے ہوتا ہے جو آنکھیں رکھتے ہوں۔ اب اگر کوئی آنکھیں رکھتے ہوئے بھی ان پر پٹی باندھ لے تو ظاہر ہے کہ اس کے حق میں بھی آفتاب کا وجود عدم کے برابر ہی رہے گا۔ قرآن کی جو آیات توحید اور معاد کے دلائل پر مشتمل ہیں، ان میں مسلمانوں کے لیے ایمان کی زیادتی، یقین کی تجلی اور بصیرت کی روشنی کا غیر محدود مواد ودیعت کر دیا گیا تھا مگر انھوں نے کہا کہ "ان آیات کا تعلق کفار و منکرین سے تھا، فلاں فلاں آیتیں منافقین کے حق میں نازل ہوئی تھیں، اور قرآن کا اتنا حصہ مشرکوں کو سامنے رکھتا ہے، اس لیے ان آیتوں اور قرآن کے ان حصوں میں ہمارے لیے برکتِ تلاوت کے سوا کچھ نہیں ہے۔" یہ کہنے اور جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِیْنَ کی یہ ذہنی کارروائی انجام دے لینے کے بعد نا ممکن تھا کہ وہ ان آیات سے وہ فائدہ حاصل کرتے جو ان سے مطلوب تھا۔ دراصل اس باب میں وہ اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے مناصبِ رسالت کے فہم و ادراک سے عاجز یا غافل ہو بیٹھے۔ انھیں یاد نہیں رہا کہ رسول اللہ کی بعثت کا مقصد صرف احکام و قوانینِ الٰہی کی تبلیغ ہی نہیں تھا بلکہ کچھ اور بھی تھا۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (آل عمران - ۱۶۴)

یہ اللہ تعالیٰ کا مومنوں پر بڑا احسان ہے کہ اس نے ان کے درمیان ایک ایسا رسول برپا کیا جو ان کو اس کی آیات سناتا ہے، ان کی زندگیاں سنوارتا ہے، اور انھیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

موضوع بحث کی مناسبت سے یہاں صرف دو باتیں سامنے رکھ لینے کی ہیں۔ ایک تو یہ کہ کلام کا رخ اہل ایمان کی طرف ہے۔ دوسری یہ کہ مقاصد بعثت میں سے ایک اور پہلا مقصد یہ ہے کہ "رسول مومنوں پر اللہ تعالیٰ کی آیات کی تلاوت کرتا ہے"۔ آیات کی تلاوت کا مقصد یہ نہیں ہے کہ وہ قرآن کی قرات کرتا ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ قرآن کے بیان کردہ دلائل و شواہد سے ان کے دلوں میں ایمان کی جڑیں مضبوط اور اس کے کیف و اثر کو تیز کرتا رہتا ہے۔ ان دونوں باتوں کو سامنے رکھنے کے بعد اس حقیقت کے چہرے سے آخری حجاب بھی اٹھ جاتا ہے کہ قرآن کی وہ آیات، جن میں توحید و معاد کے آفاقی و انفسی دلائل مذکور ہیں، ہر صاحب ایمان کے قوائے فکر و تدبر کو براہ راست خطاب کرتی ہیں۔ پس ہر مومن کا فرض ہے کہ وہ اس خطاب کا ٹھیک ٹھیک خیر مقدم کرے اور ان پاک صداؤں کو عقل کے کانوں سے سنے جو ان آیات کے اندر سے ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کا نور یقین لیے ہوئے نکلتی ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ قیامت کی آمد غیب محض کے واقعات میں سے ہے اور کوئی انسان اس کو ایک شاہد حقیقت کی حیثیت سے نہیں پا سکتا۔ مگر قرآن ہم کو یقین دلاتا ہے کہ جزا و سزا اور یوم آخرت کے چہرے پر جو نقاب ہے وہ اتنی موٹی نہیں ہے کہ فہم و بصیرت کی نگاہوں کے لیے اس کی جھلکیوں کی گرفت ناممکن ہو، بلکہ یہ نقاب صرف اسی حد تک ادراک نظر سے مانع ہے جس حد تک کہ ایک حاملہ کا گوشت پوست حمل کے وجود کو عام نگاہوں سے چھپا سکتا ہے۔

يَسْأَلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰهَا ۭ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ ۚ لَا يُجَلِّيْهَا لِوَقْتِهَآ اِلَّا هُوَ ۘ ثَقُلَتْ فِي

یہ لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ قیامت کا جہاز کہاں لنگر انداز ہوگا۔ کہہ دو اس کا علم تو محض میرے رب کو ہے، اپنے وقت پر اس کو وہی بے نقاب کرے گا۔ لیکن اتنا تو بہرحال ضرور

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً (الاعراف - ۱۸۷)

اپنی نگاہ فکر و تدبر سے دیکھ سکتا ہے کہ آسمانوں اور زمین کے شکم کے اندر وہ ایک بھاری بوجھ کی طرح ہو رہی ہے۔ وہ جب آئے گی بالکل اچانک نمودار ہو گی۔

یعنی جس طرح ایک نو مہینے کی حاملہ اپنی ہیئت کذائی میں خود اپنے حمل کا خاموش اعلان کرتی ہے اور اپنے پیٹ کے چھپے ہوئے بچے کو منظر عام پر لے آنے کے لیے بس ایک حکم کی منتظر ہوتی ہے، بعینہٖ ایسا ہی حال اس کائنات کے بطن میں قیامت کا بھی ہے کہ وہ اس کے "شکم" میں ایک "تام الحمل" کی طرح موجود ہے، اس کے بوجھ سے یہ "شکم" پوری طرح گرانبار ہے اور اسے نکال کر سامنے رکھ دینے کے لیے بس ایک حکم کی راہ تک رہا ہے۔ شکم کائنات میں اس حمل کی گرانباری اتنی نمایاں ہے کہ جس کی چشم خرد میں کچھ بھی بینائی ہو گی وہ اسے محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

غرض ایک مومن کا فرض ہے کہ وہ ایمانیات کے باب میں کبھی اس حد پر جا کر نہ ٹھہر جائے کہ "میں خدا اور یوم جزا پر ایمان رکھنے والوں میں شامل ہو چکا ہوں، اب مجھے ان کے رموز و نکات اور ان کے دلائل و شواہد کی تحقیق و جستجو میں اپنی قوتیں صرف کرنے کی ضرورت نہیں"۔ یہ ایک شدید تباہ کن غلط اندیشی ہے۔ اس کے برعکس اس کو ہر وقت غور و فکر میں لگا رہنا چاہیے اور قرآن کی ایمان افروز آیات میں تدبر کرتے ہوئے اپنے اس علم اور نظریہ کو کہ "قیامت آئے گی اور ایک روز جزا برپا ہو گا" یقین کی حد تک پہنچانے کی مسلسل کوشش کرتے رہنا چاہیے۔

استحضارِ فکرِ آخرت اس کے بعد دوسری چیز جو ایک مومن کے لیے ضروری ہے، یہ ہے کہ آخرت کا یہ علم و یقین اس کے دماغ کی حدود سے نکل کر اس کی روح کے نہاں خانوں میں سرایت کر جائے اور اس کے حافظہ کے اطراف و جوانب پر پوری طرح چھا جائے۔ اس کو خدائے قہار کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے اعمال کی جوابدہی کا خیال حتی الامکان کبھی بھولنے نہ پائے۔ وہ کہیں بھی ہو، کسی حال میں بھی ہو، اس بڑے دن کے ہولناک محاسبے سے غافل اور بے فکر نہ ہو۔ آخرت کا یہ کبھی نہ فراموش ہونے والا اندیشہ ہی دراصل نیک روی اور صلاحِ عمل کی جان ہے، اور اسی بنا پر میزان الٰہی میں اس کا جو وزن ہے وہ ناقابلِ وہم و خیال ہے۔

قدرتی طور پر اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے اور ایک خدا ترس انسان کی نگاہ پوری تجسس کے ساتھ معلوم کرنا چاہے گی کہ وہ کیا ذرائع اور تدابیر ہیں جن کو اختیار کر کے اس سرچشمۂ تقویٰ اور اس کلید بندگی کو حاصل کیا جاسکتا ہے ؟ سو اگر ہمارے اندر حق طلبی کا سچا جذبہ موجود ہو تو ہم کو مطمئن رہنا چاہیے کہ اللہ اور اس کے رسول نے اس مہتم بالشان معاملہ میں بھی ہماری رہنمائی کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ہے۔ ارشادات نبوی پر نظر ڈالیے اور دیکھیے کہ آنحضرت صلعم نے موت کو، جو قیامت کا مقدمہ اور حیات اخروی کا دیباچہ ہے اور جس کو یاد رکھنا در اصل یوم آخرت ہی کو یاد رکھنا ہے، برابر اپنی چشم تصور کے سامنے رکھنے کے کتنے فضائل بیان کیے ہیں اور صحابہ کو اس کی کتنی تاکید فرمائی ہے۔ مثال کے طور پر چند حدیثیں ملاحظہ ہوں۔ حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکثروا ذکر ھاذم اللذات الموت (ترمذی۔ نسائی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اُس چیز کو بکثرت یاد کرتے رہو جو دنیوی لذتوں کو ڈھا دینے والی ہے، یعنی موت کو۔

حضرت ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلعم نے اپنے اصحابؓ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

استحیوا من اللہ حق الحیاء ..... من استحیی من اللہ حق الحیاء ..... ولیذکر الموت والبلی (ترمذی۔ احمد)

اللہ تعالیٰ سے حیا کرو جیسا کہ اس سے حیا کرنے کا حق ہے ..... جو شخص اللہ تعالیٰ سے حیا کرنے کا حق ادا کرنا چاہے اس کو لازم ہے کہ ..... موت اور اس کی آزمائشوں کو یاد کرے۔

بخاری کی مشہور حدیث ہے کہ آنحضرت صلعم نے حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کا شانہ پکڑ کر پورے اہتمام سے انھیں سکھایا:

کن فی الدنیا کانک غریب او عابر سبیل

دنیا میں ایک اجنبی بلکہ ایک راہرو کی طرح رہو جس کی کوئی شے تم کو تمھارے اصلی "وطن" یعنی اس دوسرے عالم سے غافل کر دے

نہ صرف یہ کہ موت، قیامت، آخرت اور جزا و سزا کے خیالات کا استحضار اہل ایمان کے لیے اتنا ضروری ہے کہ اس کے لیے شارع نے اپنی کوئی امکانی تدبیر اٹھا نہیں رکھی اور اس کی خاطر بعض ایسے اعمال کا بھی حکم دیا جو فی نفسہٖ خام کار لوگوں کے مبتلائے فتنہ ہو جانے کے امکانات سے خالی نہ تھے، چنانچہ قبروں کی زیارت کی ممانعت کرنے کے کچھ دنوں بعد اس کی اجازت دے دی گئی بلکہ اس کی ترغیب اور تاکید بھی فرمائی گئی ہے، جیسا کہ صحیح مسلم میں

حضرت بریدہؓ سے روایت ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

نھیتکم عن زیارۃ القبور فزوروھا

میں نے تمھیں قبروں کے پاس جانے سے روک دیا تھا، مگر اب تم جایا کرو۔

زیارت قبور کی یہ ممانعت کیوں ہوئی تھی؟ ظاہر ہے کہ اس کا سبب اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ ابتدا میں لوگ توحید کے جامع اور تفصیلی تصور کو ہضم نہیں کر سکتے تھے اور زمانہ جاہلیت کے مشرکانہ آداب و رسوم سے، جن کے وہ برسوں عادی رہ چکے تھے، ان کے دل و دماغ پوری طرح مانجھ کر قابل اطمینان حد تک مجلّٰی نہیں کیے جا سکے تھے۔ اس لیے اندیشہ تھا کہ کہیں اپنے بزرگوں کی قبروں پر جاکر ناواقفیت کی حالت میں اضطراری طور پر کچھ ایسی حرکتیں نہ کر بیٹھیں جو لوازم توحید کے منافی ہوں، جیسا کہ بنی اسرائیل کی تاریخ بتاتی ہے کہ چونکہ مصر میں رہ کر قبطیوں کے مشرکانہ عقائد و اعمال سے وہ مانوس ہو گئے تھے اس لیے حضرت موسیٰ کے ہمراہ سفر کرتے وقت جب ان کا گذر ایک ایسی قوم پر سے ہوا جس نے اپنے معبدوں میں بے شمار مورتیوں کو خدائی کے تخت پر بٹھا رکھا تھا تو اپنے اسی ہادی و سردار سے، جو ان کو اول روز سے ایک بن دیکھے خدا کی پرستش کا درس دے رہا تھا، بے تابانہ اور بے باکانہ اس خواہش کا اظہار کر بیٹھے کہ اِجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ (اے موسیٰ! جس طرح ان کے بہت سے معبود ہیں ہمارے لیے بھی ایک معبود بنا دے)۔ پس شرک زدہ ذہنیتوں کا یہی خطرہ تھا جس کے پیش نظر ہادی اعظم نے اس وقت تک قبروں پر جانے سے بھی عام مسلمانوں کو روک رکھا جب تک کہ ان کے اندر توحید کی پوری روح اپنے تمام لوازم و مقتضیات کے ساتھ اتر نہیں گئی۔ پھر جب یہ ہو چکا تو آپ نے اپنی گذشتہ ممانعت کو واپس لیتے ہوئے اس کی اجازت دے دی، اور نہ صرف اجازت دے دی بلکہ اس کی تاکید بھی کر دی۔ اس اجازت اور تاکید کی غایت اور ضرورت کیا تھی جس کے عظیم تر فوائد کی خاطر اس زیارت قبور کا حکم دیا گیا جو بہر حال بالفعل نہ سہی، بالقوہ کسی نہ کسی مرحلہ پر پہنچ کر مشرکانہ وساوس کو ابھارنے کی صلاحیت اپنے اندر رکھتی ہے؟ اس کا جواب بھی خود اسی پاک زبان سے سنیے جس نے یہ حکم دیا ہے:

عن ابن مسعودؓ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال نھیتکم عن زیارۃ القبور فزوروھا فانھا تزھد فی الدنیا وتذکر الاٰخرۃ (ابن ماجہ)

حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا "میں نے تم لوگوں کو قبروں کی زیارت سے منع کر دیا تھا، مگر اب تم ان کی زیارت کیا کرو کیونکہ قبروں کی زیارت دنیا سے بے رغبتی پیدا کرتی ہے اور آخرت کو یاد دلاتی ہے۔

مسلم کی ایک حدیث میں زیارتِ قبور کی یہی غرض و غایت ان لفظوں میں بیان ہوئی ہے:

..... فزوروا القبور فانھا تذکر الموت	..... سو قبروں کے پاس جایا کرو، کیونکہ وہ موت کو یاد دلاتی ہیں۔

پس فکرِ آخرت کو ہر دم تازہ رکھنے کا سب سے بڑا وسیلہ یہ ہے کہ انسان اپنی موت کو کثرت سے یاد کرتا رہے اور اس طرح فکرِ آخرت کے ساتھ اپنے تعلق کو پائدار کرتا ہوا اس مقام پر پہنچنے کی کوشش کرے جس کی نشاندہی حضرت ابن عمرؓ کی اس زریں نصیحت میں موجود ہے:

اذا امسیت فلا تنتظر الصباح واذا اصبحت فلا تنتظر المساء (بخاری)	جب شام ہو تو صبح کا انتظار نہ کرو اور جب صبح کرو تو شام کا انتظار نہ کرو۔

پھر موت اور آخرت کی اس یاد کو با اثر کرنے کی خاطر اس شہرِ خموشاں کی سیر بھی کرتے رہنا چاہیے جہاں ہمارے ہی جیسے انسانوں کی بستی ہے مگر جو اب عمل کے میدان سے نکل کر اپنے رب کے حضور بے چارگی کے عالم میں لا کھڑے کیے گئے ہیں۔ یقیناً اس منظر کے اندر ایک نگاہِ عبرت پذیر اور ایک دلِ حق آشنا کے لیے بہت کچھ سامانِ فکرِ آخرت موجود ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ انسان تریاق کو اپنے حق میں خود زہر بنا لے اور قبروں کو سامانِ فکرِ آخرت بنانے کی بجائے خدائی طاقتوں کا یا روحانی فیوض کا ایک "سب اسٹیشن" بنا کر انہی کو پوجنا یا ان پر مراقبے اور اعتکاف کرنا شروع کر دے۔

دوسری چیز جو اس فکرِ آخرت میں زندگی اور تازگی پیدا کرنے کا موثر ذریعہ بنتی ہے وہ سارے قرآن کی بالعموم اور ان آیات کی بالخصوص، جن میں قیامت کے پرہول کوائف و مناظر بیان کیے گئے ہیں حضورِ قلب کے ساتھ تلاوت ہے۔ چنانچہ قرآن مومنوں کی صفت ہی یہی بتاتا ہے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا۔ (الانفال ۔ ۱)	سچے مومن تو صرف وہ لوگ ہیں جو اللہ کا ذکر سنتے ہیں تو ان کے دل کانپ اٹھتے ہیں اور جب ان کو اس کی آیات پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے۔

پھر اس تلاوت کا بھی اعلیٰ و افضل طریقہ مطلوب یہ ہے کہ قرآن کو نماز کے اندر پڑھا جائے، جیسے کہ انسان

اپنی کامل شان عبدیت میں ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے اس کو انتہائی قربت حاصل ہوتی ہے۔ نماز کے اندر پڑھنے سے آیات قرآنی کا اثر دو آتشہ ہو جاتا ہے۔ مگر اب تو صورت حال یہ ہو چکی ہے کہ نماز کے لیے ان سورتوں کا انتخاب مشکل ہی سے کیا جاتا ہے جو ایک سانس میں ختم نہ ہو سکیں، اور اس پر مزید ستم یہ کہ جو کچھ بھی پڑھا جاتا ہے اس کے مفہوم و مطالب سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کی روشن ہدایتیں، اور اس کی پہاڑوں تک کو تھرتھرا دینے والی قوتیں ہمارے لیے بے اثر ہو کر رہ گئی ہیں جس پیمانے سے ہم نے ان کو ناپا، کیا وجہ ہے کہ اسی پیمانہ سے وہ ہم کو نہ ناپیں!

ہم ایمان بالآخرت کی اس بحث کو ختم کرنے سے پہلے اس حقیقت کی طرف پھر توجہ دلائیں گے کہ اللہ کے دین کی اقامت کا نام لینے سے پہلے ہمیں تمام دوسرے محرکات سے اپنے دلوں کو پاک کر کے صرف آخرت کی بازپرس کے احساس کو سامنے رکھنا چاہیے۔ نیز یہ کہ ایمان بالآخرت میں سے تقلیدی جمود نکال کر اس کے اندر ذاتی معرفت اور بصیرت کی بیدار روح پیدا کرنی چاہیے۔ یقیناً وہ بھی مسلمان ہی تھے جو ہوا کے تیز و تند جھکڑوں کو دیکھ کر سمجھتے تھے کہ کہیں وہ یوم موعود آ گیا جب یہ دنیا تباہ کر کے ایک دوسرا عالم بنایا جائے گا اور ہمیں اپنی کمائی میں سے ایک ایک پائی کا حساب دینا پڑے گا۔ اور یہ گمان ایک مجسم خوف بن کر ان کے ذہنوں کو اس طرح گھیر دیتا تھا کہ وہ پناہ ڈھونڈھنے کے لیے مسجد نبوی کی طرف دوڑ پڑتے تھے۔ اور ان کے مقابلہ میں ایک ہم بھی مسلمان ہیں جن کے سکون خاطر میں آج کا بڑے سے بڑا قہر خداوندی کوئی ہلکا سا تلاطم بھی نہیں پیدا کر سکتا۔ یہی قرآن ہے جس کی ایک آیت فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ شَهِيدًا جب قیامت کے منظر کا ایک پرتو دکھاتی ہے تو وہ آنکھیں جن کی طرف جہنم کی چشم و ہم بھی اٹھنے کا حوصلہ نہیں کر سکتی، ابل پڑتی ہیں اور رات کا بڑا حصہ اسی رکعت کے قیام میں ختم ہو جاتا ہے اور زبانِ پر اضطراب اسی ایک آیت کو برابر دہراتی چلی جاتی ہے اور آخرت کی بازپرس کے احساس کی شدت ہے کہ نہ آنکھوں کو اشک باری سے رکنے دیتی ہے نہ زبان کو آگے بڑھنے کی اجازت دیتی ہے۔ اور آج وہی قرآن ہے جس کی رعد و برق کی سی دھمکیاں نہ ہماری آنکھوں سے ایک قطرہ اشک نکلوا سکتی ہیں اور نہ ہی تلاوت کے وقت ہماری زبانوں کی روانی میں کوئی رکاوٹ پیدا کر سکتی ہیں۔ یاد رہے یہ ایک نا دیدہ قلب حال ہے، اس کے ساتھ دین حق کی نہ اطاعت ہو سکتی نہ اقامت، دین کی اطاعت و اقامت کے لیے ضروری ہے کہ اس قلبِ حال کا بھی قلب حال کیا جائے۔

(باقی)

رسائل و مسائل

چند شبہات و اعتراضات

سوال: عرض ہے کہ میں جماعت کا رکن تو نہیں ہوں لیکن بحمد اللہ میں جماعت کی تشکیل سے بھی پہلے اس جماعت کا ہم خیال اور ایک سرگرم حامی تھا۔ جماعت کا مسلک اور نصب العین معلوم ہونے کے بعد گویا اپنے میں بالکل پختگی محسوس کی۔ رکن نہ بننے کا فائدہ ابتک یہ حاصل ہوا کہ دوسری جماعتوں کے مطالعہ کا بھی موقع ملتا رہا اور تجسس کی نگاہ سے انھیں دیکھا۔ ایمانداری کی بات یہ ہے کہ جانبین سے بعض تجربات اور اعتراضات ایسے نظر میں آئے جن کا فیصلہ ابتک میں نہ کرسکا تاہم نوے فیصدی پھر بھی اپنے فطری میلان کے باعث آپ کی جماعت کا ہمخیال رہا اس لیے میں جو کچھ عرض کر رہا ہوں وہ صرف سمجھنے کے لیے اور ہمدرد ہونے کی حیثیت سے کر رہا ہوں تاکہ دوسروں کے دریافت کرنے پر مجھے بے جا تاویلیں نہ کرنی پڑیں:

(۱) آپ فرماتے ہیں کہ درجہ اول کے لوگوں کا یہ فرض ہے کہ وہ کسی شعبۂ زندگی میں حکومت وقت سے مدد نہ لیں۔ لوگ اس پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ بجا ہے اگر آپ کا لٹریچر وغیرہ یا گھر بار لوگ لوٹ لیں تو خیر آپ چپ رہیں گے، لیکن یہ آپ کی ڈاک، بجلی، ریل، شکر وغیرہ تمام ضروریات کہاں سے آتی ہیں؟ اگر حکومت طاغوتی سے امداد حاصل آپنے کی تو آپ صف اول میں نہ رہے یا صف اول کی مزید تشریح کی جائے گی؟

(۲) آپ فرماتے ہیں کہ ہم اپنی جماعت میں وہ آدمی چاہتے ہیں جو خانقاہی زاہدوں سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہوں اور دوسری طرف عام دنیا داروں سے بہت زیادہ ماہر تجربہ کار اور سیاستداں

ہوں۔ جب تک ایسا نہ ہوگا اس وقت تک اللہ تعالیٰ زمام کار ان لوگوں کے ہاتھ میں نہ دیگا۔
تو عرض ہے کہ پہلی بات تو ان لوگوں میں یقیناً دوسروں یعنی رسمی زاہدوں سے بہت کم ہے اور اسے حاصل کرنے کی کوئی تجویز آپ کے پروگرام میں نظر بھی نہیں آتی۔ یہ میں نے اس لیے عرض کیا کہ میں ذاتی طور پر دوسری جماعتوں میں بھی شریک ہوا تھا ان لوگوں میں اس زہد کی تعلیم و تربیت دیکھی جس کا مشاہدہ شریک ہونے والا رات کو سونے کے بعد سورج طلوع ہونے سے پہلے ہی کر لیتا ہے اور پھر سچ عرض کرتا ہوں کہ اخلاق و عادات اور خدا ترسی کا وہ عالم دیکھا کہ اور تو اور میں خود بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اور جس کا بین فرق میں نے یہاں آتے ہی محسوس کیا۔ مثلاً ان لوگوں کا آپس میں دوسروں کے ساتھ حسن سلوک، ملنے جلنے کا رنگ ڈھنگ، ایثار و قربانی، تہجد گذاری، ذکر الٰہی راتوں کا رونا، لمبی لمبی مسنون دعائیں۔ یہ اور اسی شعبے کے دیگر لوازمات نسبتاً ان لوگوں میں بہت زیادہ ہیں۔ بحمد اللہ اصل دین کی پختگی اور اس راہ کی قربانی میں ضرور اُن جماعتوں کے متعلقین اس جماعت کے متعلقین سے پیچھے ہیں لیکن جن باتوں کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے آخر وہ بھی تو دین ہی کی کوئی شاخ ہیں۔ پھر سوال یہ ہے کہ وہ خوبیاں آپ کے لوگوں میں کیوں نہوں۔ مزید برآں یہ کہ انتظام میں نے جس قدر وہاں دیکھا وہ بھی یہاں کالعدم ہے۔ وہاں ہر گروہ ایک امیر کے ماتحت ہوتا ہے اور جب تک گشت ہو کسی کو بغیر امیر کی اجازت کے بازار یا سیر تک جانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اور ہر لمحہ انھیں عام دنیا کی باتیں، فضول باتیں، بے جا مذاق، دوسروں پر آوازیں کسنا ان سب باتوں سے بچنے کی تعلیم ہوتی رہتی ہے۔ میں نہایت ادب کے ساتھ عرض گذار ہوں کہ آخر اس باب میں آپ کی جماعت کیوں پیچھے ہو۔ آپ نے بار بار فرمایا ہے کہ صف اول کے لوگ رخصت پر عمل کرنے سے پرہیز کرتے ہوئے عزیمت کی طرف دوڑیں تو کیا فقہی مسائل میں عزیمت کا درجہ صف اول کے لیے ضروری نہیں ؟ یہ تو عرض تھی آپ کے فرمان کے پہلے جز پر یعنی ہم رسمی زاہدوں سے کہیں بہتر زاہد چاہتے ہیں۔ اب دوسرا حصہ ہے یعنی عام دنیاداروں سے زیادہ فہمیدہ اور تجربہ کار ہماری جماعت میں ملیں۔ اس کے لیے بھی وہی پہلی عرض ہے کہ جب موجودہ سائنس اور

صنعت و حرفت اور مشنری سب کی سب حکومت وقت کے ہاتھ میں ہے، اور ان کی درسگاہوں میں ہم خود یا اپنی اولاد کو بھیج نہیں سکتے تو پھر وہ اس صورت میں کیونکر عام دنیاداروں سے اس باب میں زیادہ فہمیدہ ثابت ہوں گے۔ اس فرمان پر جب لوگ اعتراض کرتے ہیں تو مجھے بہت دور از کار تاویلیں کرنی پڑتی ہیں۔ جتنے لوگ یہاں ہیں اگر حکومت طاغوتی سے مدد نہ لیتے تو یہاں تک پہنچ بھی نہ سکتے تو پھر یہاں کا سب سامان یہی لاؤڈ اسپیکر، بجلی، ریل اور موٹر بلکہ ہمارا خورد و نوش آپ کے لٹریچر کا کاغذ اور اسی طرح کی سب ضروریات زندگی کیا حکومت سے امداد کے ضمن میں نہیں آتیں؟ ان لوگوں میں تو خیر کوئی بی۔ اے ہے تو کوئی ایم۔ اے خواہ امتحان نہ ہی دیا ہو۔ کوئی انجینیر اور کوئی جج لیکن اپنی ملازمتوں کو چھوڑ کر صف اول میں آنے والے ان سب لوگوں کی یہ بیدار مغزی کیا چیز ہے؟ جہاں تک میں سوچ سکا ہوں حکومت کی درسگاہوں سے حاصل کی ہوئی معرفت ہی کا مرہون منت ہے۔ اب عرض ہے کہ یہ حضرات سو دو سو سال زندہ رہ نہیں سکتے۔ لازماً اس کام کو چلانے کے لیے ان کی اولادیں کام آئیں گی تو ان میں زہد و دینداری تو خیر ان کا یا ہمارے بس کی چیز ہے لیکن دنیا فہمی کیسے آئے گی؟ شاید آپ اس کا جواب یہ دیں کہ سیدھی سی بات کیوں نہیں سمجھ لیتے کہ یہ سب انگریز اور موجودہ درسگاہوں اور صنعتوں کے ماہر اور مالک خود اسی نظام میں آجائیں گے اور یہ سوال ہی باقی نہ رہے گا۔ مگر میرا اور عوام کا اعتراض نہیں بلکہ شبہ یا وسوسہ اچھی جگہ پر ہے اس لیے کہ سوال تو نظام قائم کر دینے ہی سے متعلق ہے کہ اس کے قیام کے لیے ایسی فہمیدہ جماعت کی ضرورت ہے جو ہر باب میں یہاں تک کہ جب ہمیں ضروری طاقت کے بعد اپنے راستے سے رکاوٹیں ہٹانے کے لیے ہاتھا پائی کی بھی ضرورت پڑ جائے تو ہماری ہاتھا پائی بھی موجودہ حکومت کی ہاتھا پائی سے زیادہ سخت اور با اصول ہو تو پھر یہ تمام باتیں کہاں سے سیکھیں گے؟ ہمیں یا ہماری اولاد کو کوئی تکلیف اٹھائے بغیر اس نظام کے قیام کا موقع مل جائے اور پوری حکومت حکومت الٰہی کو قبول کر لے، ایسے نصیب ہمارے کہاں۔ رسول صلعم کو بھی آخر جنگ کی ضرورت پیش آ ہی گئی۔ تو ایسی صورت میں وینا! تو ہماری جماعت اللہ کے فضل سے

پوری ہوگی لیکن دنیوی ہتھیار سے کیسے آراستہ ہوگی؟

جواب: (۱) یوں بحث کرنے والے کے لیے تو بحث و جدال کی بڑی گنجائش ہے لیکن جو شخص سنجیدگی کے ساتھ غور کرے گا وہ آسانی کے ساتھ فیصلہ کر سکتا ہے کہ حکومت سے استمداد اور اُن ذرائع سے فائدہ اٹھا لینے میں بڑا فرق ہے جن پر حکومت قابض ہے۔ ہم نے جو کچھ لکھا ہے اس کا منشاء یہ ہے کہ اس نظام باطل کے اندر صرف کلمۂ الٰہی کو بلند کرنے کے لیے زندگی بسر کرنا چاہیے۔ جو شخص اس جدوجہد میں لگ گیا ہے وہ جان سکتا ہے کہ وہ کن کن مواقع پر مجبور ہے کہ اپنی زندگی کو محفوظ رکھنے یا اپنے مقصد زندگی کو پورا کرنے کے لیے موجودہ نظام کے مقبوضہ ذرائع و وسائل کو کام میں لائے۔ ریل، تار، ڈاک وغیرہ سے ایک ایسے شخص کا فائدہ اٹھا لینا جو اعلاء کلمۂ حق کی جدوجہد میں لگا ہوا ہے حکومت سے استمداد نہیں ہے بلکہ جن ذرائع و وسائل پر حکومت بلا کسی حق کے قابض ہے ان کو ناگزیر حد تک مقصد حق میں استعمال کر لیتا ہے۔ اس بات میں اور اس بات میں کہ ایک شخص اپنے تمام حقوق جان و مال کی محافظت کے لیے حکومت سے استمداد کرتا ہے بڑا فرق ہے۔ اور حکومت کی امداد کی شکلیں تو اس سے بالکل مختلف ہیں اور ہر شخص بادنیٰ تامل ان میں فرق کر سکتا ہے لیکن بہت سے لوگ جان بوجھ کر التباس پیدا کرتے ہیں اور ان کے ترکش کے سب سے زیادہ قیمتی تیر اسی قسم کے قیاس مع الفارق ہیں۔ درحقیقت لوگوں کی نظر اس بات پر نہیں ہے کہ جو اہل حق کسی نظام باطل کے اندر گھر گئے ہوں ان کے لیے نہ تو یہ بات جائز ہے کہ اس نظام کے اجزاء کی طرح اس کے کل پرزے بن جائیں اور نہ یہ بات جائز ہے کہ اس سے فی الفور علیحدگی اور ترک تعلق اختیار کریں بلکہ ان کے لیے صحیح طرز عمل یہ ہے کہ اس کے اندر رہ کر جس حد تک ممکن ہو اس سے احتراز اختیار کریں اور جس حد تک مقصد حق کی خدمت کے لیے ناگزیر ہو اس کے ذرائع و وسائل کو استعمال کریں۔ پس یہ ریل، تار، ٹیلیفون کے استعمال کی اجازت بھی ہم محض اس لیے دیتے ہیں کہ مقصد حق کی خدمت اس کے لیے ہمیں مجبور کرتی ہے ورنہ جن لوگوں کا سینہ اس عشق سے بالکل خالی ہے اس نظام باطل کے اندر ان کی ساری زندگی گناہ و معصیت ہے۔

(۲) آپ کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ ہمارے پروگرام میں تقویٰ کے حصول کی کوئی تدبیر نہیں بتائی

گئی ہے۔ دراصل اس باب میں ہمارا خیال یہ ہے کہ اصلی تقویٰ اقامتِ دین کی جدوجہد میں حاصل ہوتا ہے۔ جو شخص اللہ کے قائم کیے ہوئے حدود کی حفاظت کے لیے اور اس کے حکموں کو اپنے اوپر اور دوسروں کے اوپر قائم کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا ہے اور خدا کے حضور جوابدہی کے احساس کے ساتھ یہ کام کر رہا ہے اس کا ہر لمحہ تقویٰ اور حصولِ تقویٰ کی جدوجہد میں بسر ہو رہا ہے۔ ہم اس جدوجہد کے باہر تقویٰ کے حصول کے قائل نہیں ہیں۔ آپ نے تقویٰ کے جن اشکال کا ذکر فرمایا ہے ان کے اجزائے دین ہونے میں شبہ نہیں ہے لیکن ان کا اعتبار اصولِ دین کی اقامت کی جدوجہد ہی کی صورت میں ہو سکتا ہے۔ اگر اصولِ دین منہدم ہو رہے ہوں اور ان کے لیے لوگوں میں بے چینی نہ پیدا ہو تو مجھے امید نہیں ہے کہ ہم تقویٰ کی ان صورتوں سے خدا کے مواخذہ سے بچ سکیں گے۔ جماعت اسلامی کے ارکان میں دوسری جماعتوں کے مقابل میں اس اعتبار سے اگر کچھ کمی آپ کو نظر آ رہی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ ان لوگوں کے اندر فروعِ دین کا شعور اصولِ دین کے شعور کے تحت پیدا ہو۔ جس رفتار سے دین میں ان کی معرفت بڑھتی جائے گی اسی رفتار سے ان میں ذوقِ دینی نشو و نما پائے گا اور پھر اسی رفتار سے ان میں اجزاء و فروع کا اہتمام بھی ترقی کرے گا۔ ہم ترتیب کو الٹ کر یہ نہیں چاہتے کہ لوگوں میں دینداری کی نمائش کا جذبہ پیدا ہو

(۳) کسی مقصد کے لیے اشخاص کو تیار کرنے میں مقدم شے اس مقصد کے لیے ان کے اندر راسخ ایمان پیدا کرنا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے قابلیت پیدا کرنا ایک امر ثانوی ہے۔ جو جماعت کسی چیز کا سچا عزم اپنے اندر پیدا کر لیتی ہے وہ اس کی قابلیت اور اس کے حصول کے وسائل و ذرائع ہزاروں راہوں سے خود بخود پیدا کر لیتی ہے۔ آپ اس بات کے لیے بالکل مضطرب نہ ہوں کہ اگر مسلمان موجودہ کافرانہ درسگاہوں سے علیحدہ کر لیے گئے تو ان میں وہ قابلیت کہاں سے پیدا ہو گی جو ان کے حریفوں پر ان کو فوقیت دلا سکے۔ ہم کو پورا یقین ہے کہ ایک جماعتِ حق اپنے حریفوں کے مقابل میں دس گنی قوت تو محض اپنے اصولوں کی سچائی اور اپنے ایمان کی بدولت بڑھا لیتی ہے۔ اس کے بعد اگر کچھ کمی رہ جاتی ہے تو وہ یوں پوری ہوتی ہے کہ حق کی اپیل کے مقابل میں چونکہ نسلی و قومی تعصبات حائل نہیں ہوتے اس وجہ سے ہر قوم کے لائق اور اہل افراد کھنچ کھنچ کر اس میں شامل ہوتے جاتے ہیں۔ یہ لوگ مل کر پہلے

اپنی جماعت بناتے ہیں۔ پھر یہ جماعت اپنے لیے سازگار ماحول تلاش کرتی ہے جہاں اس کی قابلیتیں پھل پھول سکیں۔ وقت سے پہلے اس کا کوئی متعین نقشہ نہیں پیش کیا جا سکتا لیکن دنیا کی تاریخ بالخصوص وہ تاریخ جو قرآن میں بیان ہوئی ہے اس کی شہادت دیتی ہے کہ ایسا ہوتا ہے اور ہم کو اس پر پورا یقین ہے اس معاملہ میں ہمارا پورا بھروسہ چارہ سازِ غیب کی کارسازی پر ہونا چاہیے۔ یہ خواہش نہیں کرنی چاہیے کہ پہلے قدم پر پوری منزل سامنے آجائے۔

باقی رہے وہ لوگ جو اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ وہ موجودہ طاغوتی درسگاہوں سے جہادِ حق کے لیے قوت و قابلیت فراہم کر رہے ہیں وہ ایک فریبِ نفس میں مبتلا ہیں ان کے لیے دعا کرنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ ان پر حق واضح کر دے۔

اتمامِ حجت سے پہلے تکفیر

سوال: ۱۶ر اپریل کے اخبار "کوثر" میں مولانا امین احسن صاحب اصلاحی کا مضمون "تکفیر و تفسیق" کے متعلق جو شائع ہوا ہے اور غالباً ترجمان القرآن میں بھی وہ شائع ہوا ہے، اس مضمون کے پڑھنے کے وقت بعض اجزاء مجھے بھی غیر مانوس سے معلوم ہوئے، لیکن تحریکِ اسلامی کے عام لٹریچر کے مطالعہ کی بنا پر تحریک کے بنیادی مقاصد سے اتفاق، اور حسنِ ظن کی بنا پر اس کی کچھ تاویل کرنے لگا۔ لیکن اس کے بعد چند دوستوں نے، جو معاندیا خواہ مخواہ نکتہ چین نہیں بلکہ جماعت کے ہمدرد اور متاثر ہیں مجھے اس کی طرف خاص توجہ دلائی۔ ان کا کہنا ہے کہ عام مسلمانوں کو ان کی غلطیوں، گمراہیوں یا اضطراری ضلالتوں کی بنا پر ایمان سے محروم قرار نہ دینا تو درست ہے۔ اور یہ بھی درست ہے کہ غیر مسلم قومیں قابلِ نفرت نہیں بلکہ قابلِ رحم اور قابلِ تبلیغ ہیں۔ لیکن یہ لکھنا کس طرح صحیح ہے کہ اس زمانہ میں تبلیغ اور اتمامِ حجت سے پہلے ہم کو یہ حق حاصل نہیں کہ ہم ان کو کافر سمجھیں یا کافر قرار دے کر ان سے بیزاری اور علیحدگی اختیار کریں۔ اس مضمون سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ اب جبکہ پوری تبلیغ اور صحیح طریقہ سے

اتمام حجت نہیں ہو رہا ہے تو ہم موجودہ حالات میں ہندو، سکھ، انگریز، پارسی وغیرہ قوموں کو بھی نہ کافر سمجھیں نہ کافر قرار دے کر ان سے بیزاری کریں۔ اور نیز اسی بنا پر مرزائیوں کو غالی شیعوں کو یا دوسرے ضروریات دین سے منکر لوگوں کو کافر نہ سمجھیں اور نہ ان سے بیزاری و علیحدگی کا اعلان کریں۔ حالانکہ ایسے لوگوں کی اصلاح بھی اس تصور کے بعد ہی ہو سکتی ہے کہ ان عقائد کفریہ کی وجہ سے ان کو کافر قرار دیا جائے اور کفر کے احکام ان پر جاری کیے جائیں۔ اور خود ان کو تبلیغ کرنا بھی تو ان کے کفر کے مقتضیات ہی میں سے ہے۔ اور جو کچھ اس مضمون کے مطالعہ سے سمجھ میں آتا ہے اسی کو تمام تمام مسلمانوں کے باطل فرقے مثلاً مرزائی آئندہ پیش کریں گے کہ اتمام حجت سے پہلے تم ہماری تکفیر کیسے کرتے ہو۔ اور پچاس سال کے عرصہ میں مرزائی عقائد کی تردید میں جو جو کچھ لکھا گیا یا کہا گیا ہے ان سب کو تو وہ بھی اتمام حجت نہیں سمجھتے اور مضمون میں بھی یہی کہا گیا ہے کہ اب تک الٹی سیدھی تدبیریں کی گئیں لیکن شرائط کے موافق تبلیغ نہیں ہوئی لہذا اتمام حجت بھی نہیں ہوا۔

میرے ان احباب نے یہی اشکالات پیش کیے۔ میں نے جواب دینے اور سمجھانے کی کوشش تو کی لیکن میں مضمون کے بعض الفاظ کو درست ثابت نہ کر سکا۔ اور غالباً صاحب مضمون کا مقصد یقیناً وہی ہو گا جو بظاہر سمجھ میں آتا ہے۔ اور بہت سے لوگوں کو جو حقیقتاً مخلص و ہمدرد ہیں یہ چیز یا کھٹکی ہوں گی۔ اس لیے آپ براہ مہربانی ترجمان کی کسی قریبی اشاعت میں اس مسئلہ کو ذرا خوب واضح کر دیں۔ تاکہ جو جو توہمات پیدا ہو سکتے ہیں ان کا دفعیہ ہو جائے اور ایک درست مسئلہ سمجھاتے ہوئے کہیں غلط خیالات لوگوں کے ذہن میں بیٹھ نہ جائیں۔ امید ہے کہ آپ اس پر ضرور توجہ فرمائیں گے اور تفصیلی تشریح کر کے اس بے چینی کو دور کر دیں گے۔ جو معاندوں کے نہیں بلکہ اپنوں کے دلوں میں پیدا ہو گئی ہے۔

جواب: جب آپ اس بات کو صحیح تسلیم کرتے ہیں کہ عام مسلمانوں کو ان کی گمراہیوں اور ضلالتوں پر ایمان سے محروم نہ قرار دینا چاہیے تو پھر اس بات کے تسلیم کرنے میں آپ کو کیوں تردد ہے کہ غیر مسلموں کو بھی ان کی گمراہیوں اور ضلالتوں پر کافر قرار دے کر ان سے اعلان علیحدگی نہیں کرنا چاہیے؟

آخر مسلمانوں کو یہ الاؤنس جو آپ دے رہے ہیں اس کی وجہ یہی تو ہے کہ آج امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا وہ شرعی ادارہ موجود نہیں ہے جو ان پر دین کی حجت تمام کر سکے؟ پھر جب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ادارہ کے درہم برہم ہو جانے کی وجہ سے آپ مسلمانوں کو ایک ایسی رعایت دے رہے ہیں جس کے وہ غیر مسلموں کے مقابلہ میں کم تر مستحق ہیں تو آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ وہی رعایت آپ غیر مسلموں کو دینے سے انکار کر رہے ہیں؛ حالانکہ شہادت علی الناس کا وہ شرعی نظام جس کے بغیر اتمام حجت ممکن نہیں ہے، آج موجود نہیں ہے۔ ایک ہی نوعیت کے جرم پر دو شخصوں سے دو طرح کا معاملہ کرنا ایک ایسے شخص سے تو ممکن ہے جو کسی نسلی اور قومی تعصب میں مبتلا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ جو نہ کسی تعصب میں مبتلا ہے، نہ کسی سے کوئی خاص جانبداری برتتا ہے، آخر کس بنا پر ایک مسلمان گمراہ کو راہ یاب قرار دے اور ایک ہندو گمراہ کو مستحق دار ٹھیرائے؟ آپ حضرات کی یہ منطق میری سمجھ میں نہیں آتی کہ ایک مسلمان تو ساری نافرمانیوں اور بغاوتوں کے باوجود ایمان سے محروم نہیں قرار دیا جا سکتا، حالانکہ وہ مسلمان گھرانے میں پیدا ہوا، اسلامی روایات اس نے ورثہ میں پائیں، زندگی بھر اسلام اسلام پکارتا رہا، لیکن ایک غیر مسلم اپنے غیر اسلامی اعمال و عقائد پر جہنمی قرار دیا جائے گا، درانحالیکہ اس کے سامنے دین حق کی شہادت دینے کی ذمہ داری جن لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈالی گئی تھی، انھوں نے نہ صرف یہ کہ شہادت کے شرائط کے مطابق اس کے سامنے شہادت نہیں دی، بلکہ الٹے قومی اور نسلی تعصبات پھیلا کر اس کو اسلام سے بدگمان اور متنفر کر دیا۔

آپ اگر اپنے اس جذبہ کی اچھی طرح تحلیل کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ جذبہ اسلام کی محبت کا نہیں ہے، بلکہ مسلمانوں کی محبت کا جذبہ ہے جس کو آپ اسلامی جوش غیرت کے رنگ میں پیش کر رہے ہیں۔ حالانکہ یہ وہ خود پرستی ہے جس میں یہود اور نصاریٰ مبتلا تھے۔ ان کے نزدیک بھی کفر و ایمان کا فیصلہ ایمان و عقائد کی بنیاد پر نہیں ہوتا تھا، بلکہ نسل و نسب کی بنا پر ہوتا تھا۔ كُونُوا هُودًا اَوْ نَصَارٰى تَهْتَدُوا الآیہ

آپ کا یہ معارضہ کہ اس مضمون سے ثابت ہو رہا ہے کہ اب جبکہ پوری تبلیغ اور صحیح طریقہ سے اتمام حجت نہیں ہو رہا ہے تو ہم موجودہ حالات میں ہندو، سکھ، انگریز، پارسی وغیرہ قوموں کو بھی کافر نہ سمجھیں، نہ کافر قرار دے کر ان سے بیزاری کریں، عجیب و غریب ہے۔ یہ تو بہر حال واقعہ ہے جس کو تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ

آج تبلیغ اور اتمام حجت نہیں ہو رہا ہے اور یہ بھی از روئے شرع مسلّم ہے کہ بغیر اتمام حجت تکفیر اور اعلان برأت جائز نہیں۔ اب اگر آپ اپنے موجودہ رویہ ہی کو صحیح ثابت کرنا چاہتے ہیں تو یا تو یہ ثابت کیجیے کہ آج تبلیغ اور اتمام حجت کے تمام ضروری وسائل برسرکار ہیں، یا یہ ثابت کیجیے کہ بغیر تبلیغ اور اتمام حجت کے بھی تکفیر اور اعلان برأت درست ہے۔ لیکن جب آپ ان دونوں باتوں میں سے کوئی بات بھی نہیں ثابت کر رہے ہیں تو ہم سے یہ مطالبہ کیوں کر رہے ہیں کہ ہم ایک حقیقت کے اظہار سے اس لیے رک جائیں کہ اس سے آپ کے ایک غلط مزعومہ کی غلطی ثابت ہو رہی ہے؟ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ آپ بجائے اس کے کہ اپنی غلطی کو درست کرنے کے لیے ہماری صحیح بات کو غلط کرنے کی کوشش کریں، اپنے ہی رویہ کو درست کر لیں اور ساری دنیا کی تکفیر اور اعلان برأت سے پہلے اس فرض تبلیغ و شہادت علی الناس کی ذمہ داری ادا کریں جو امت مسلمہ پر واجب ہے۔

آپ کا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ اہل کفر کے کفر کی اصلاح کا راستہ تکفیر اور اعلان برأت ہے۔ تکفیر اور اعلان برأت تو سزا ہے جو اہل کفر کو اس وقت دی جاتی ہے جب وہ اہل حق کی دعوتِ اصلاح کو قبول نہیں کرتے اور آخری حد تک اتمام حجت کے بعد بھی اپنے جمود و انکار ہی پر اڑے رہتے ہیں۔ میرے جس مضمون سے آپ کو یہ شبہ پیدا ہوا ہے اس میں میں نے تفصیل کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آنحضرت صلعم کی دعوت کی مثال دے کر ثابت کیا ہے کہ انھوں نے اپنی قوم کے کافر ہونے کا اور ان سے برأت کا اعلان اس وقت کیا ہے جب پوری طرح اتمام حجت کر دینے کے بعد ان کے اندر سے ہجرت کر جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ یہ خود اس بات کا ثبوت ہے کہ جب تک اہل تکفیر کی اصلاح کی جد و جہد کا امکان ہوتا ہے اس وقت تک نہ ان کی تکفیر کی جاتی ہے، نہ ان سے علیحدگی کا اعلان کیا جاتا ہے، بلکہ سارا زور اس بات پر صرف کیا جاتا ہے کہ ان کے اندر کفر و شرک کا صحیح شعور پیدا ہو۔ اور نفسیاتی اعتبار سے بھی یہی بات صحیح معلوم ہوتی ہے کہ جس جماعت کی اصلاح مدنظر ہو ان سے اعلان برأت نہ کیا جائے اور نہ ان کی تکفیر کی جائے، کیونکہ جن کی تکفیر کر کے آپ نے ان سے علیحدگی اختیار کر لی، آپ نے اپنی بات سننے کے لیے ان کے دلوں میں گنجائش ہی کہاں چھوڑی!

قادیانیوں اور دوسری قوموں کا طعنہ اگر صحیح ہے تو اس کو برداشت کیجیے۔ محض اس وجہ سے کہ

وہ آپ کو طعنہ دیں گے، ہم یہ تو تسلیم کرتے رہے کہ آپ نے صحیح طریق پر فرض شہادت ادا کیا ہے۔ براہ کرم جنوری ۴۶ء کے اشارات ضرور پڑھ لیجیے۔ یہ ساری غلط فہمی آپ کو محض اس وجہ سے ہو رہی ہے کہ آپ نے اس سلسلہ کے سارے مضامین نہیں پڑھے ہیں۔ میرے نزدیک تو مسلمانوں نے اگر فرض شہادت علی الناس کو صحیح طور پر ادا کیا ہوتا تو نہ کوئی باطل فرقہ جنم لے سکتا تھا اور نہ جنم لے کر باقی رہ سکتا تھا۔ آدمی کی یہ خواہش ضرور ہوتی ہے کہ اس کے کام کی تعریف ہو، لیکن انصاف بھی تو آخر کوئی چیز ہے۔ جو کام غلط ہوئے ہیں آخر ان کی تعریف کیسے کی جائے؟

آخر میں یہ توضیح بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ "کافر قرار دینا یا کافر سمجھنا" یا "اعلان برأت" وغیرہ الفاظ سے میں نے ان کے شرعی اور قانونی مفہوم کو مراد لیا ہے، یعنی وہ "کافر سمجھنا" جس پر احکام مترتب ہوں۔ ورنہ ظاہر ہے کہ جس شخص میں کفر کے خصائل جمع ہوں اس کو ہر ذی شعور مسلمان کافر ہی خیال کرتا ہے اور اس کے اعمال و اخلاق سے اپنے دامن کو بچانے کی بھی کوشش کرتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس کو اُس طرح کا کافر نہیں قرار دیا جا سکتا کہ اس سے روابط کا اس طرح انقطاع ہو جائے جس طرح ہجرت کے بعد آنحضرت صلعم کا قریش کے ساتھ ہو گیا۔ اور نہ اس سے اس مفہوم میں اعلان برأت ہی کیا جا سکتا ہے جس مفہوم میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے "انا برآؤا منکم" میں کیا۔

قضیہ فلسطین میں ہمارا رویہ

سوال: بعض ہمدرد پوچھتے ہیں کہ فلسطین کی سیاست میں امریکہ اور برطانیہ کی خود غرضانہ دخل اندازی کے نتائج عالم آشکارا ہیں، تو آخر جماعت اسلامی نے قضیہ فلسطین کے سلسلہ میں اپنی پالیسی کیا تجویز کی ہے؟

جواب: ہم وقتی مسائل کو اتنی اہمیت نہیں دیتے کہ اپنے اصل کام کو چھوڑ کر ان کے پیچھے پڑ جائیں۔ ہمارے نزدیک برطانیہ اور امریکہ سخت ظلم کر رہے ہیں۔ فلسطین کے معاملہ میں انھوں نے بے انصافی کی حد کر دی ہے۔ اہلِ فلسطین سے ہمدردی کرنا ہر انسان کا انسانی

فرض ہے، اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے تو ہمارے لیے یہ فرض کئی گنا زیادہ سخت ہو جاتا ہے کہ ہم اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ ہمدردی کریں۔ پھر فلسطین کا مسئلہ اس لیے بھی اہم ہے کہ اگر خدانخواستہ وہاں یہودی ریاست بن گئی تو اس سے مرکزِ اسلام یعنی حجاز کو بھی متعدد قسم کے خطرات لاحق ہو جائیں گے۔ اس معاملہ میں دنیا کے مسلمان مدافعت کے لیے جو کچھ بھی کریں ہم اس میں ان کے ساتھ ہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک اصلی مسئلہ فلسطین یا ہندوستان یا ایران یا ٹرکی کا نہیں ہے بلکہ اصل مسئلہ کفر و اسلام کی کشمکش کا ہے اور ہم اپنا سارا وقت، ساری قوت اور ساری توجہ اسی مسئلہ پر صرف کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ جب تک یہ مسئلہ حل نہیں ہوتا، دوسرے مسائل کے حل ہو جانے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

غیر اسلامی حکومت کے ذریعے تحصیل زکوٰۃ

سوال: حالاتِ حاضرہ کا پیدا کردہ ایک سوال دریافت کرتا ہوں۔ یہ کہ کیا ہماری شریعت میں کسی کا فر کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ ہم سے صدقاتِ واجبہ وصول کرے یا یہ کہ حکومتِ کفر کی قانونی قوت کے ذریعہ ان کی وصولی کا اہتمام کیا جائے، اور وہ اس طرح کہ اسمبلی میں ایک زکوٰۃ بل پاس کرالیا جائے؟ امید ہے کہ واضح جواب دیا جائے گا۔

جواب: زکوٰۃ کی تحصیل اور اس کی تقسیم کا نظام اگر قائم ہو سکتا ہے تو صرف اس طرح کہ مسلمانوں کا کوئی آزاد اجتماعی نظام ہو جو بااختیار بھی ہو اور وہ اس کو انجام دے۔ رہی یہ صورت کہ ایک ایسی اسمبلی میں زکوٰۃ بل پاس کرایا جائے جس کی اکثریت غیر مسلم ہے اور جو قانونِ اسلام کو بالاتر قانون تسلیم نہیں کرتی تو یہ چیز شرعاً بالکل غلط ہے اور اس طریقہ سے اگر غیر مسلم حکومت کے زیرِ اثر زکوٰۃ کی وصولی اور تقسیم کا انتظام کیا گیا تو شرعاً زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔

مطبوعات

اسلام کا نظام سیاست و عدالت از جناب مولوی یعقوب الرحمن صاحب عثمانی۔ قیمت مجلد عہ

شائع کردہ نفیس اکیڈیمی۔ عابد روڈ۔ حیدرآباد، دکن۔

اس کتاب کے عنوان میں ایک سلیم الطبع مسلمان کے لیے خاصی جاذبیت موجود ہے اور نئی نسل جو اسلامی فکر و حکمت کے سرچشموں کی طرف پلٹ پلٹ کر دیکھ رہی ہے، اس قسم کے موضوعات پر پڑھنے کا سامان چاہتی ہے، مگر افسوس اس بات پر ہے کہ ناشرین اور مصنفین نوجوانوں کے اس ذوق کے ساتھ انصاف نہیں کر رہے ہیں بلکہ سرمایہ دارانہ اور ناجرانہ انداز سے اپنے گاہکوں کی ہر پیاس کو بھانپ بھانپ کر گھٹیا سے گھٹیا سامان نوش سے ان کی تسکین کرنا چاہتے ہیں۔ پیش نظر کتاب ممکن ہے کہ مصنف نے خلوص سے لکھی ہو اور پبلشر نے خالص ذوق اسلامی کے تحت اسے شائع کیا ہو مگر اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ جتنا عظیم الشان عنوان کتاب پر ثبت ہے، اس کا حق ادا کرنے کے لیے اس کی شان سے دسواں حصہ محنت و تحقیق سے بھی کام نہیں لیا گیا۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان اوراق میں اسلام کے علمائے متقدمین کی کتابوں میں سے بہت سے علمی نکات بھی اخذ کر کے سجائے گئے ہیں، اور مسلمانوں کی تاریخ کے بعض اجزا بھی آراستہ کیے گئے ہیں اور بہت سے مفید حوالے بھی جمع ہیں، مگر محض اتنے سے کام کا نام تحقیق نہیں ہے۔ صاحب کتاب نہ تو اس عنوان کے متعلق اہم مباحث کا تعین کر سکے ہیں، نہ بحث میں کوئی ترتیب ہے اور نہ استدلال و استنباط ہی میں کوئی خوبی پائی جاتی ہے۔ بس کچھ مواد ہے جو ایک دردمند اسلام نے کاغذ کے میدان میں بکھیر دیا ہے۔

حکومت الٰہیہ اور علماء و مفکرین مرتبہ جناب ابو محمد امام الدین صاحب رام نگری۔ صفحات ۲۰۰

قیمت مجلد مع رنگین گرد پوش للعہ

یہ کتاب دراصل ایک مجموعۂ مضامین ہے جو مسلمانوں کے مختلف علماء اور مصنفین کے قلموں سے ایک ہی معنی و مدعا کی وضاحت کے لیے نکلے ہیں۔ یہ گویا ہمارے اہل قلم حضرات کی ایک متفقہ دعوت اور ایک

متحدہ پکار ہے ــــ ٹھیک اسلامی نصب العین کی طرف، ٹھیک مسلمان کے حقیقی مقصد حیات کی طرف اور ٹھیک قرآن کے مطلوب کی طرف۔

مگر تعجب ہوتا ہے کہ جب اسی متحدہ دعوت اور اسی متفقہ مقصد کی طرف چند جانیں لپک آتی ہیں اور سعی و جہد کا آغاز کرتی ہیں تو اختلافات اور اعتراضات چاروں طرف سے امڈ کر آجاتے ہیں اور جس راہ حق کو ہماری امت کا اجتماعی دماغ راہ حق کہتا ہے اس پر چلنے والوں کے قدم پکڑ لیے جاتے ہیں کہ اور جس راہ پر چاہو چلو تمہیں چھوٹ ہے، مگر خدا کے لیے ادھر نہ چلو۔ ایسے تمام اختلافات اور اعتراضات کے مصنفین کے لیے یہ کتاب ایک اچھا اطمینان بخش جواب ہے۔ آخر یہ حضرات کس کس ہستی کی مزاحمت کریں گے؟ کیا مولانا سید سلیمان ندوی کی؟ مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کی؟ مولانا ابوالحسن صاحب ندوی کی؟ مولانا حمیدالدین فراہی مرحوم کی؟ ــــ اس صف میں ہر گروہ کا قبلۂ عقیدت موجود ہے!

ان پکارنے والوں میں اگر کوئی ایسا ہو جو اپنی ہی پکار کی مخالفت کرنے میں پہلے نمبر پر ہو تو لوگوں کا کام ہے کہ اس سے تصریح طلب کریں۔

مرتب نے بعض ایسے اصحاب کے مضامین بھی شامل کرلیے ہیں جن کے قلم سے ممکن ہے کہ اسلام کے حق میں چند مدحیہ کلمات ٹپک گئے ہوں مگر داعیان حق کی صف میں ان کا کوئی مقام نہیں ہے۔

تاجدار دو عالم | مصنفہ عبدالرحمن عزام پاشا ۔ جنرل سکریٹری عرب لیگ قاہرہ۔ مترجمہ ظہور و جدانی۔

قیمت ۲؎ مجلد۔

نبی کریم کی سیرت پر مختلف عنوانات کے تحت سبق آموز معلومات جمع کی گئی ہیں ــــ مگر دو باتیں ضرور کھٹکتی ہیں، ایک تو مباحث کی تعبیر عالمانہ اور محققانہ انداز کی نہیں ہے اور دوسرے اس کے پس منظر میں کوئی ایسا متعین نظریۂ دین کام نہیں کر رہا جو دلوں کو جنبش میں لائے اور خونوں کو حرکت دے اور افکار کی تطہیر کرسکے۔ اور یہ خوبیاں نہ پیدا ہوسکیں تو نبی کی سیرت لکھنے کا کام کسی مناسب ہستی کے لیے چھوڑ کر دوسرے میدانہائے کار کی طرف توجہ کرنا انسب ہے!

اب رہی ترجمہ کی حیثیت، سوائے ناقص ترجمہ کہے بغیر چارہ نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عربی محاورہ

اور روزمرہ سے مترجم کو آگاہی نہیں اور یا اردو محاورہ و روزمرہ سے ذوق نہیں، یا پھر دونوں کے معاملہ میں معذوری ہے!

تاہم یہ ضرور عرض کیا جا سکتا ہے کہ سیرت کے موضوع پر معمولی درجہ کی جو کتابیں شائع ہوتی رہتی ہیں ان کے اندر اس کتاب کا اچھا مقام ہے۔ خواندہ طبقہ کسی ناول کے خریدنے کے بجائے کیوں نہ اسے خرید

جنگ مشرق مرتبہ جناب مولوی محمد اسحٰق صاحب بی۔ اے، بی۔ عثمانیہ و جناب زبیدہ تبسم صاحبہ مولوی فاضل۔
قیمت مجلد عا کلدار۔ ملنے کا پتہ: ادارۂ نشریات اردو، حیدرآباد، دکن۔

مغربیوں کی جنگ نے مشرق بعید میں جو خونی ناچ ناچا ہے وہ تاریخ سیاست میں بڑی اہمیت رکھتا ہے اور اس پر بہت کچھ لکھنے کی ضرورت ہے مگر پیش نظر کتاب محض صحافتی اور اخباری سی معلومات کا مجموعہ ہونے کی وجہ سے اس ضرورت کو پورا نہیں کرتی۔ اس کی افادیت اتنی ہی ہے کہ خواندہ عوام کچھ سرسری معلومات حاصل کریں۔

بت شکن یا جہاد سخن مرتبہ جناب ایم فدا حسین صاحب فدا، ناظم ادارۂ عالیہ مجددیہ۔ لاہور۔ قیمت عہ

اس مختصر کتاب میں اقبال اور تاج صاحب کا موازنہ کیا گیا ہے اور اس سلسلہ میں مختلف اخبارات کی کچھ بحثیں بھی جمع کر دی گئی ہیں۔ جناب تاج الدین احمد صاحب تاج ہندوستان کے ان گنتی کے لوگوں میں سے ہیں جو خلوص کے ساتھ اس رائے پر جمے ہوئے ہیں کہ اقبال کی تحریروں سے نہ تو اسلام کی کوئی خدمت ہوئی ہے اور نہ بحیثیت شاعری اس کا کوئی مرتبہ ہے۔ "بت شکن" میں دونوں شاعروں کے نتائج افکار پہلو بہ پہلو درج ہیں اور ساتھ ہی حامیان اقبال کے اعتراضات اور ان کے جوابات "ناقابل برداشت" زبان میں جمع کیے گئے ہیں ــــ اس زبان اور انداز بیان کو دیکھا جائے تو اس کتاب کا شائع ہونا نہ ہونے سے زیادہ مضر ہے! معنوی حیثیت سے اگر کتاب میں صرف اتنی بات کہی گئی ہوتی کہ اقبال کو نبی کی طرح معصوم ماننا غلط ہے تو ہم اس سے متفق ہوتے مگر اسے خیر و خوبی سے بالکل محروم قرار دینا صریح ناانصافی ہے؟

(بقیہ مضمون صفحہ ۱۲) ۵- جماعتی تربیت کا پانچواں اصول یہ ہے کہ جماعت کے سامنے آزمائش کے جو مواقع آئیں ان میں جماعت کی غلطیوں اور خامیوں پر پوری نظر رکھی جائے اور جب وہ وقت گذر جائے اور اطمینان سے سانس لینے کا موقع میسر آجائے تو ان میں سے ہر غلطی اور خامی پر بے رو رعایت تنقید کی جائے۔ اور جو عملی کمزوریاں جن اعتقادی خامیوں کی غمازی کر رہی ہیں ان کو بھی پوری وضاحت کے ساتھ کھول کر لوگوں کے سامنے رکھ دیا جائے۔ شروع شروع میں اس تنقید کا خطاب عام ہونا چاہیے۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ اپنی اپنی جگہ پر ہر شخص اس تنقید سے متنبہ ہوگا پہلے ہی مرحلہ میں متعین طور پر صرف غلط کاروں کو ملامت کرنے سے ان کو اپنی رسوائی کا احساس ہوتا ہے جس سے ان کے اندر اصلاح حال کے بجائے عند اور ہٹ دھرمی کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ البتہ جب کسی گروہ کے متعلق بار بار کے تجربے کے بعد بھی یہی ثابت ہو کہ وہ جماعت کے اصول سے صرف کسی ذہنی الجھن کی وجہ سے یا محض اتفاقی طور پر انحراف نہیں کر رہا ہے بلکہ قصد و ارادہ کے ساتھ اس نے منافقت ہی کو اپنا شیوہ بنا لیا ہے تو اس کو براہ راست اس کی غلطیوں پر تنبیہ کرنا چاہیے اور پردہ داری اور مجاملت کا طریقہ بدل دینا چاہیے۔ یہ تو آخری تنبیہ ہے۔ اس کے بعد بھی اگر یہ گروہ اپنی اصلاح نہ کرے تو جماعت کا فرض ہے کہ اس کو اپنے اندر سے بالکل کاٹ پھینکیں۔ اس طرح کے لوگوں کے لیے نظام جماعت کے اندر کوئی گنجائش نہیں ہونی چاہیے۔ آنحضرت صلعم نے منافقین کے ساتھ یہی طریقہ اختیار فرمایا، اور یہی طریقہ جماعتی تربیت کے لیے عقل و فطرت کے مطابق ہے۔ جو لوگ قرآن مجید پر نظر رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اسلام کی تاریخ میں بدر کی لڑائی وہ پہلا آزمائشی موقع ہے جب یہ حقیقت سامنے آئی کہ اسلامی جماعت کے اندر کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اپنے اندر کچھ جراثیم نفاق کے چھپائے ہوئے ہیں۔ قرآن نے ان لوگوں کے طرز عمل پر نہایت سختی سے تنقید کی جس کی شہادت سورہ انفال سے مل رہی ہے لیکن نہ تو تشخیص و تعین کے ساتھ ان کو مخاطب کر کے ان کو رسوا کیا، نہ ان کو جماعت ہی سے الگ کیا۔ اس کے بعد ہر آزمائش کے موقع پر یہ گروہ اپنی کمزوریاں ظاہر کرتا رہا لیکن عام تنقید و نصیحت کے سوا قرآن نے ان پر براہ راست کوئی ضرب نہیں لگائی اور تقریباً سفر تبوک تک یہی صورت حال قائم رہی لیکن جب اچھی طرح حجت تمام ہو گئی اور یہ بات بالکل واضح ہو گئی کہ ان لوگوں کی شرارتیں بے علمی یا اتفاقی مغلوب الحالی کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ جو کچھ کر رہے ہیں سوچ سمجھ کر ٹھنڈے دل سے کر رہے ہیں تو یہ لوگ جماعت کے اندر سے کاٹ کر علیحدہ کر دیے گئے۔

مطبوعات مکتبہ جماعت اسلامی

الجہاد فی الاسلام	۸/۰	اسلام اور ضبط ولادت	۱/-
رسالہ دینیات	۱/۸	سود	۲/۸
حقوق الزوجین	۱/۸	اشتراکیت اور نظام اسلام	۳/۸
مسئلہ قومیت	۱/۸		
مسئلہ جبر و قدر	۱/-	نیا نظام تعلیم	-/۶/-
تجدید و احیائے دین	۱/-	ہندوستان میں تحریک اسلامی کا آئندہ	
اسلامی عبادات پر تحقیقی نظر	۱/-	لائحہ عمل	(زیر طبع)
قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں	۱/۳	دین حق	-/۶/-
سیاسی کشمکش حصہ اول	۱/۳	اسلام اور جاہلیت	-/۷/-
سیاسی کشمکش حصہ دوم	۲/۸	ایک اہم استفتاء	-/۳/-
سیاسی کشمکش حصہ سوم	۲/۸	دستور جماعت اسلامی	-/۳/-
اسلام کا نظام حیات	-/۱۰/-	روداد جماعت اسلامی حصہ اول	۱/-
پردہ	۲/۸	روداد جماعت اسلامی حصہ دوم	-/۱۳/-
تنقیحات	۲/۸	روداد جماعت اسلامی حصہ سوم	۲/-
خطبات (نیا ایڈیشن)	۳/-	روداد جماعت اسلامی حصہ پنجم	۲/-
تفہیمات	۳/۸	روداد اجتماع خواتین	-/۱۲/-
حقیقت توحید	۱/۲	جماعت اسلامی کی دعوت' بناؤ بگاڑ	فی -/۶/-
حقیقت تقویٰ	-/۱۲/-	حقیقت شرک	۲/-

عربی مطبوعات

اسلام کا نظریہ سیاسی	۱/-	انسان کا معاشی مسئلہ	۱/-
اسلامی حکومت	۱/-	اسلام اور جاہلیت	۱/-
دین حق	۱/-	شہادت حق	۱/-

سرورق مطبوعہ رین پریس ، لاہور